رجب المرجب ۱۴۴۳ھ
فروری ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آخری صلیبی جنگ
بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

رفیقِ تنظیم اور قرآن حکیم
ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

• خوبصورت ٹائٹل • عمدہ سفید کاغذ • معیاری طباعت

1. 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں
(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)
مکمل سیٹ کی قیمت: 5000 روپے

2. متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید
• قرآنی رسم الخط • تفسیری سائز • مضبوط ریگزین جلد
2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں
مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 71

شمارہ : 2

رجب المرجب 1443ھ

فروری 2022ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِ تعاون: 400 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

ڈیورنڈ لائن: تاریخی حقائق — ادارہ

بیانُ القرآن — 9

سورۃ الحشر (آیات ۱۱ تا ۲۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ — 23

آخری صلیبی جنگ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ہماری دعوت — 40

رفیقِ تنظیم اسلامی اور قرآنِ حکیم — ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ؟ — 57

التوحید فی القرآن — پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ

ظروف و احوال — 63

صلیبیوں کے فکری و عسکری حملے — رضی الدین سیّد

انوارِ ہدایت — 71

خوفِ خدا اور فکرِ آخرت — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

علومِ قرآنی — 76

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ (۳) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

ڈیورنڈ لائن: تاریخی حقائق

گزشتہ تقریباً ایک ماہ سے پاک افغان بارڈر پر کچھ تلخ واقعات کی خبریں گردش کر رہی ہیں۔ وائرل ہونے والی کچھ ویڈیوز میں دکھایا گیا ہے کہ بارڈر پر لگی باڑ کو افغان طالبان ہٹا رہے ہیں اور ان کا ایک سینئر اہلکار پاکستانی فوجیوں کو کہہ رہا ہے کہ سرحد پر دوبارہ باڑ لگانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس سے قبل طالبان حکومت کے قائم مقام وزیر اطلاعات ذبیح اللہ مجاہد نے پاکستانی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے بیان کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ ابھی حل طلب ہے‘ اس وجہ سے پاکستان کو اس پر باڑ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

پاک افغان بارڈر کے تقریباً دو ہزار چھ سو کلومیٹر حصے کو ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب برطانیہ اس علاقے پر قابض ہو گیا تو وہ چاہتا تھا کہ اس کے اور روس کے درمیان ایک بفر سٹیٹ ہو۔ لہٰذا تاجِ برطانیہ کے وزیر برائے امورِ خارجہ ڈیورنڈ اور والیٔ کابل عبدالرحمان خان کے درمیان پہلے اس حوالے سے مراسلات کا تبادلہ ہوا اور بعد ازاں ۱۲ نومبر ۱۸۹۳ء کو دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں اس ڈیورنڈ لائن کو طے کیا گیا۔ اس معاہدے میں قرار پایا تھا کہ دونوں فریق ڈیورنڈ لائن کے آر پار اپنی اپنی حدود میں رہیں گے اور ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے۔ اس معاہدے کے پیچھے برطانیہ کا اصل مقصد روس کو کاؤنٹر کرنا تھا۔ گویا ڈیورنڈ لائن کے حوالے سے افغانستان آغاز سے ہی آن بورڈ تھا۔ البتہ اس علاقے میں موجود قبائل نے اس تقسیم کو تسلیم نہیں کیا تھا‘ کیونکہ یہ قبائل دونوں طرف آباد تھے۔ اسی وجہ سے جب ۱۸۹۳ء میں ڈیورنڈ لائن قائم ہوئی تو ۱۹۱۹ء تک تین اینگلو افغان جنگیں ہوئیں۔ تیسری اینگلو افغان جنگ کے خاتمے پر ڈیورنڈ معاہدہ میں ترمیم کر کے نیا اینگلو افغان معاہدہ ہوا۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں افغانستان کے صدر سردار داؤد خان نے پاکستان کا سرکاری دورہ کیا اور ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈیورنڈ لائن کو سرکاری طور پر تسلیم کیا۔

نائن الیون کے بعد امریکہ افغانستان میں در آیا تو یہ تنازع ایک بار پھر گرم ہو گیا اور افغانستان میں امریکہ کی کٹھ پتلی حکومتوں نے اس تنازع کو مزید ہوا دی۔ اصل میں پاکستان اور افغانستان کا

بارڈر پہلے بالکل ایک سافٹ بارڈر تھا‘ لوگوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جب نائن الیون کے بعد پاکستان میں دہشت گردی عروج پر چلی گئی تو پاک فوج کو مجبوراً وہاں پر باڑ لگانی پڑی‘ کیونکہ اُس وقت افغانستان میں اشرف غنی جیسے لوگوں کی حکومت تھی جنہیں امریکہ اور بھارت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ سی آئی اے اور ’’را‘‘ وہیں سے دہشت گرد تیار کر کے پاکستان میں بھیجتے تھے۔ اگر یہ باڑ نہ لگائی گئی ہوتی تو پاکستان میں ابھی تک خوں ریزی جاری رہتی‘ کیونکہ حامد کرزئی اور اشرف غنی نے پاکستان کے حوالے سے اپنے عوام کے ذہنوں میں اتنا زہر گھول دیا تھا اور امریکہ نے اس کام کے لیے اتنی فنڈنگ کی تھی کہ وہاں کے عوام پاکستان کو اپنا مخالف سمجھنے لگے تھے۔

اب وہاں اگرچہ افغان طالبان کی حکومت ہے جو پاکستان سے کشیدگی نہیں چاہتے لیکن عوام میں ایسا طبقہ ابھی بھی موجود ہے جو اشرف غنی‘ بھارت اور امریکہ کا پالا ہوا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو دوبارہ ہوا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے افغان طالبان کو بھی اپنے عوام کا اعتماد رکھنا ہے اور وہ اس تنازع کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کے خواہاں ہیں۔ جیسا کہ طالبان وزارت خارجہ کے ترجمان عبدالقہار بلخی کا کہنا تھا کہ طالبان حکومت سرحدی معاملے کو اچھے ہمسایوں کی طرح افہام و تفہیم اور بات چیت کے ساتھ حل کرنے پر یقین رکھتی ہے اور اس معاملے کو سفارتی ذریعے سے حل کرے گی‘ لیکن طاغوتی طاقتوں کی پوری کوشش ہو گی کہ اس سرحد پر کشیدگی بڑھے۔

نوآبادیاتی طاقتوں کا سب سے بڑا مقصد اُمتِ مُسلمہ کو تقسیم و تفریق کے ذریعے کمزور کرنا تھا تاکہ مسلمان آپس میں لڑتے اور اُلجھتے رہیں۔ وہ اپنا اجتماعی مقصد اور اجتماعی دینی فرائض بھول جائیں اور دین کی جگہ وطن کو اوڑھنا بچھونا بنا لیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے میدانِ جنگ میں کم ہی شکستیں کھائی ہیں لیکن باہم دست و گریباں ہو کر زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔ اُمتِ مُسلمہ میں سازشوں کا معاملہ تو جنگِ جمل (۶۵۶ء/۳۶ھ) سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر جنگِ صفین (۶۵۷ء/۳۷ھ) ہوئی تھی۔ ان جنگوں میں مسلمانوں کو آپس میں لڑایا گیا۔ ان سازشوں کا آغاز ایک یہودی عبداللہ بن سبا سے ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے یہی صورتِ حال بعد میں بھی جاری رہی۔ مسلمان اس کا صحیح ادراک نہ کر سکے جب کہ دشمن سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کو شکست دینے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ ان میں آپس میں اختلاف ڈالا جائے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے لیے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا گیا۔ عربوں نے بغاوت کی اور ترک پورے مشرقِ وسطیٰ میں ہار گئے۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم میں سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح اسرائیل کا مقابلہ تمام عرب ممالک کے ساتھ تھا۔ چھوٹا سا اسرائیل عرب ممالک کی آپس کی چپقلش‘ ذاتی مفاد وغیرہ کی وجہ سے ان پر حاوی ہے۔

پھر افغانستان کی مثال لیں۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک سات مجاہدین جماعتوں کا اتحاد تھا جس

کی وجہ سے انہوں نے روس کو شکست دی‘ لیکن وہی اتحاد ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۶ء تک آپس میں لڑتا رہا یا لڑایا گیا جس کی وجہ سے ان کی ہوا اُکھڑ گئی۔ خون خرابہ ہوا‘ بدامنی ہوئی اور افغانستان تہس نہس ہو گیا۔ پھر طالبان آئے تو انہوں نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں امن قائم کیا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا اور پھر بیس سالہ جدّوجُہد کے بعد افغان طالبان نے امریکہ اور نیٹو کو شکست دی۔ یعنی مسلمانوں کو جب بھی شکست ہوئی‘ آپس کی لڑائی کی وجہ سے ہوئی اور جہاں مسلمان غالب ہوئے وہاں متحد ہونے کی وجہ سے ہی ہوئے۔

خلافت کے خاتمہ کے بعد جب نسل اور قومیت کی بنیاد پر ریاستیں وجود میں آئیں تو مسلم اُمّہ کے اندر سے ’’اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ‘‘ والا معاملہ ختم ہونا شروع ہو گیا۔ یعنی مسلمان ممالک آپس میں اتحاد کرنے کی بجائے ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے۔ تاریخ کو سامنے رکھیں تو سولہویں صدی میں یورپ میں لبرل ازم کا نظریہ پروان چڑھا اور پھر ایک نظام کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ اسی نظریے پر انہوں نے سیاسی‘ معاشی‘ معاشرتی‘ تعلیمی‘ عدالتی غرضیکہ ہر قسم کے نظاموں کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ جب سیکولرازم اور لبرل ازم کی یہ تہذیب اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی تو مسلم تہذیب اور خلافت زوال کی طرف جا رہی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں خلافتِ عثمانیہ میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اب عدالتوں میں شریعت کی بنیاد پر فیصلے نہیں کیے جائیں گے۔ یعنی اُسی وقت سے قوم پرستی کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی‘ اور جب ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا تو عین اسی دن چالیس قومی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اس کا بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کا سیکولر نظام پوری دنیا میں نافذ ہو گیا۔ یعنی سیاسی‘ معاشی اور بالخصوص معاشرتی نظام بھی انہی کا رائج ہونا شروع ہو گیا۔ قومیت کی بنیاد پر قائم ریاستوں کا نقصان یہ ہوا کہ اُمّت کے اندر تنازعات پیدا ہو گئے۔ کشیدگیاں پہلے بھی ہوتی تھیں لیکن وہ اجتماعی سطح پر حل ہو جاتی تھیں۔ اب ریاستیں ایک دوسرے کی مخالف بننا شروع ہو گئیں اور ’’میرا ملک‘‘ اور ’’تمہارا ملک‘‘ کا نعرہ لگنا شروع ہو گیا۔ اسلام بحیثیت دین پسِ پشت ڈال دیا گیا اور وہ انفرادی سطح تک محدود ہو کر صرف مذہب کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے ساتھ خلافت اور جہاد کا تصوّر بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیا گیا یا کروا دیا گیا۔ پھر ’’داعش‘‘ جیسی تنظیمیں بنا کر اس تصوّر کو بدنام کر دیا گیا۔ قرآن سے دُور اور حضور ﷺ سے تعلق کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ پھر افغانستان میں معجزہ ہوا کہ افغان طالبان نے پہلے اسلامی حکومت قائم کر لی اور دوسری مرتبہ دنیا کے سب سے بڑے اتحاد کو شکست دے دی۔ اب امریکہ نے پاکستان اور افغانستان کو بریکٹ کرنا شروع کر دیا اور اپنا نیا بیانیہ یہ بنایا کہ ’’ایف پاک‘‘ ’’ایک ایسا ریجن ہے جو اُن کے عالمی نظام کے لیے

خطرہ ہے۔ صہیونی دوسرے مذاہب کی پیشین گوئیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ مسند احمد اور بیہقی کی ایک حدیث کے مطابق یہاں مسلم اتحاد بنتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسلمانوں کے پانچ ادوار گنوائے ہیں۔ پہلا دورِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام‘ دوسرا خلافتِ راشدہ کا دور‘ پھر کاٹ کھانے والی ملوکیت کا دور‘ پھر جبر اور غلامی کا دور جو نظریاتی غلامی کی شکل میں ابھی تک جاری ہے۔ اس کے بعد پانچواں دور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ہوگا۔ دیگر احادیث میں خراسان کے علاقے کا نام آتا ہے۔ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ خراسان سے کالے جھنڈوں والا ایک لشکر نکلے گا اور اس کو کوئی نہیں روک سکے گا یہاں تک کہ وہ ایلیا میں جا کے اپنے جھنڈے گاڑ دے گا۔ ایلیا موجودہ بیت المقدس کی سرزمین کو کہا گیا ہے جہاں اس وقت اسرائیل کی ناجائز ریاست قائم ہے۔

صہیونی طاقتیں ان تمام پیشین گوئیوں سے واقف ہیں‘ اس لیے وہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان مثالی تعلقات قائم ہوں۔ اسی مقصد کے تحت پچھلے بیس سالوں میں امریکیوں نے پوری کوشش کی کہ افغانستان میں انتشار کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہرایا جائے۔ اس کوشش میں بھارت نے بھی اپنا بھرپور حصّہ ڈالا۔ افغان طالبان کے حکومت میں آنے کی وجہ سے چونکہ طاغوتی قوتوں کی باقی تمام سازشیں دفن ہو چکی ہیں اس لیے دوبارہ سرحدی تنازع کو اٹھایا جا رہا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر خطے کا امن صہیونی مقاصد کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ ہماری اصل بنیاد اسلام ہے۔ اگر ہم اسلام کی طرف پیش رفت کریں گے تو اسی میں ہماری سلامتی اور نجات ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ قومی ریاستیں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب آئیں‘ اپنے اختلاف ختم کریں اور مل کر نظامِ خلافت کی طرف پیش قدمی کریں تاکہ مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہو۔ ایک خلیفہ ہو جو ساری اُمّتِ مُسلمہ کا حکمران ہو۔ یہ ہمارا آئیڈیل نظام ہے۔ بقول اقبال ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

چونکہ اس وقت ہم ایک اُمّتِ مسلمہ نہیں ہیں لہٰذا ہمیں اس طرح کام کرنا چاہیے کہ جس ریاست میں ہم رہتے ہیں اس کا تحفظ یوں کریں کہ دوسری مسلمان ریاست کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ خلافت کے نظام کو ہدف بنا کر آگے بڑھیں‘ کیونکہ اس ادارے کو ختم کرنے کے بعد ہی ہمارا دشمن دلیر اور جری ہوا۔ اگر خلافت کا نظام دوبارہ قائم ہو جائے تو جیسے ہم پہلے دنیا پر غالب تھے اسی طرح اب بھی عالم اسلام ساری دنیا پر غالب ہوگا۔ ان شاءاللہ! ❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن — ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ الحشر

آیات ۱۱ تا ۱۷

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِہِمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا
مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ لَئِنۡ اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ وَ لَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ
اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّ اِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّہُمۡ
لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنۡ اُخۡرِجُوۡا لَا یَخۡرُجُوۡنَ مَعَہُمۡ ۚ وَ لَئِنۡ قُوۡتِلُوۡا لَا
یَنۡصُرُوۡنَہُمۡ ۚ وَ لَئِنۡ نَّصَرُوۡہُمۡ لَیُوَلُّنَّ الۡاَدۡبَارَ ۟ ثُمَّ لَا
یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ لَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ رَہۡبَۃً فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنَ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ
بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۱۳﴾ لَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ جَمِیۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی
مُّحَصَّنَۃٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاۡسُہُمۡ بَیۡنَہُمۡ شَدِیۡدٌ ؕ تَحۡسَبُہُمۡ
جَمِیۡعًا وَّ قُلُوۡبُہُمۡ شَتّٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ کَمَثَلِ
الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ قَرِیۡبًا ذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِہِمۡ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ
اَلِیۡمٌ ﴿۱۵﴾ ۚ کَمَثَلِ الشَّیۡطٰنِ اِذۡ قَالَ لِلۡاِنۡسَانِ اکۡفُرۡ ۚ فَلَمَّا کَفَرَ قَالَ
اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡکَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶﴾ فَکَانَ
عَاقِبَتَہُمَاۤ اَنَّہُمَا فِی النَّارِ خَالِدَیۡنِ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۷﴾

آیت ۱۱ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نَافَقُوۡا﴾ ’’کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو نفاق میں مبتلا ہیں‘‘

﴿یَقُوۡلُوۡنَ لِاِخۡوَانِہِمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ﴾ ’’وہ کہتے ہیں اپنے اُن بھائیوں سے جنہوں نے اہلِ کتاب میں سے کفر کیا ہے‘‘

﴿لَئِنۡ اُخۡرِجۡتُمۡ لَنَخۡرُجَنَّ مَعَکُمۡ﴾ ’’کہ اگر تم لوگوں کو (کبھی مدینہ سے) نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے‘‘

یہودیوں کے ساتھ ان منافقین کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ ان تعلقات اور روابط کی بنیاد پر منافقین وقتاً فوقتاً انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم آخری دم تک تمہارا ساتھ دیں گے اور اگر تم لوگوں کو کبھی مدینہ سے بے دخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ایسی مشکل گھڑی میں ہم شانہ بشانہ تمہارے ساتھ کھڑے ہوں گے۔

﴿وَلَا نُطِیۡعُ فِیۡکُمۡ اَحَدًا اَبَدًا ۙ﴾ ’’اور تمہارے معاملے میں ہم کسی کی بھی اطاعت نہیں کریں گے‘‘

﴿وَّاِنۡ قُوۡتِلۡتُمۡ لَنَنۡصُرَنَّکُمۡ ؕ﴾ ’’اور اگر تمہارے ساتھ جنگ کی گئی تو ہم لازماً تمہاری مدد کریں گے۔‘‘

منافقین انہیں یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہم محض وقتی طور پر بعض مصلحتوں کی وجہ سے مسلمانوں میں شامل ہوئے ہیں اور یہ کہ اس وجہ سے تمہارے ساتھ ہمارے پرانے دوستانہ تعلقات بالکل متاثر نہیں ہوں گے۔ چنانچہ تمہارے ساتھ حق دوستی نبھانے میں کوئی مصلحت بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہم بعض معاملات میں رسول اللہ ﷺ کا حکم مانتے بھی ہیں، لیکن تمہارے معاملے میں ہم ان کے حکم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ اگر مسلمانوں نے کبھی تمہارے خلاف کوئی اقدام کرنے کی کوشش کی تو ہم ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے تمہارا ساتھ دیں گے۔

﴿وَاللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿لَئِنۡ اُخۡرِجُوۡا لَا یَخۡرُجُوۡنَ مَعَہُمۡ ۚ﴾ ’’اگر وہ نکالے گئے تو یہ اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔‘‘

﴿وَلَئِنۡ قُوۡتِلُوۡا لَا یَنۡصُرُوۡنَہُمۡ ۚ﴾ ’’اور اگر اُن سے جنگ کی گئی تو یہ اُن کی مدد نہیں کریں گے۔‘‘

﴿وَلَئِنۡ نَّصَرُوۡہُمۡ لَیُوَلُّنَّ الۡاَدۡبَارَ ۟ ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’اور اگر

انہوں نے کبھی اُن کی مدد کی بھی تو پیٹھ دکھا دیں گے‘ پھر ان کی کہیں سے مدد نہیں ہو سکے گی۔‘‘

منافقین اپنے کردار و عمل سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ پست حوصلہ‘ بزدل اور جھوٹے لوگ ہیں۔ اگر ان میں جوانمردی اور غیرت و حمیت کی کوئی رمق ہوتی تو یہ دوغلا پن اختیار نہ کرتے‘ بلکہ ایمان لانے کے بعد سچے مسلمانوں کا طرزِ عمل اختیار کرتے کہ ع ’’ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم!‘‘ لہٰذا اپنے دعووں کے مطابق یہ کبھی بھی یہودیوں کا ساتھ نہیں دیں گے‘ اور اگر ان میں سے کوئی اکّا دُکّا سرپھرے لوگ حقِ دوستی نبھانے کے جوش میں یہودیوں کے ساتھ کہیں کھڑے ہو بھی گئے تو مشکل وقت آنے پر وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

آیت ۱۳ ﴿لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’(اے مسلمانو!) یقیناً تمہارا ڈر ان کے دلوں میں اللہ کی نسبت شدید تر ہے۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تم لوگوں سے ڈرتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۱۳﴾ ’’یہ اس لیے ہے کہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔‘‘

یہ لوگ سمجھ بوجھ سے عاری ہیں۔ انسان کی اصل سمجھ اور عقل تو وہ ہے جو اسے اللہ سے متعارف کرائے اور ایمان کی راہ سجھائے۔ اسی طرح انسان کے لیے علم بھی وہی فائدہ مند ہے جو اسے اس حقیقت سے آگاہ کر دے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا کی زندگی بس کھیل اور تماشا ہے۔ چونکہ منافقین ایسی عقل سے بیگانہ اور ایسے علم سے نابلد ہیں اس لیے وہ اللہ سے ڈرنے کے بجائے انسانوں سے ڈرتے ہیں اور آخرت کی قیمت پر دنیا سنوارنے کی فکر میں مگن ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَاۗءِ جُدُرٍ ۭ﴾ ’’یہ کبھی اکٹھے ہو کر تمہارے خلاف جنگ نہیں کریں گے‘ سوائے اس کے کہ قلعہ بند بستیوں میں (رہ کر لڑیں) یا دیواروں کے پیچھے سے۔‘‘

﴿بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ﴾ ’’ان کے آپس کے جھگڑے بہت سخت ہیں۔‘‘

ان کے باہمی جھگڑوں اور مخاصمت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بزدلی اور خودغرضی ان میں سے ہر ایک کے مزاج کا جزوِ لاینفک بن چکی ہے۔ ظاہر ہے اگر یہ لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے مخلص نہیں ہیں تو آپس میں ایک دوسرے سے کیسے مخلص ہو سکتے ہیں۔

﴿تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ﴾ ’’تم انہیں متحد گمان کرتے ہو‘ حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔‘‘

ہمارے موجودہ زمانے کے سیاسی اتحاد بھی بدقسمتی سے بالکل یہی نقشہ پیش کرتے ہیں‘ حتیٰ کہ ’’تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ‘‘ کے نام پر بننے والے متحدہ محاذ کے راہنماؤں کے بھی باہمی اختلافات اس قدر شدید تھے کہ ان میں سے کئی علماء ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز تک ادا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۴﴾ ’’یہ اس لیے کہ یہ ایک ایسا گروہ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ﴾ ’’(ان کا وہی حال ہوگا) جیسے اُن لوگوں کا معاملہ ہوا جو ان سے پہلے قریب ہی اپنے کیے کی سزا چکھ چکے ہیں۔‘‘

اس سے یہودی قبیلہ بنوقینقاع کے لوگ مراد ہیں جنہیں ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے بعد مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تھا‘ جبکہ بنونضیر کی جلاوطنی‘ جس کا ذکر ہم اس سورت میں پڑھ رہے ہیں‘ ۴ ہجری میں عمل میں آئی۔ اسی طرح ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب کے بعد یہودِ مدینہ کا تیسرا اور آخری قبیلہ بنوقریظہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۵﴾ ’’اور ان کے لیے بہت ہی دردناک عذاب ہے۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ﴾ ’’جیسے شیطان کی مثال‘ جب وہ انسان کو کہتا ہے کہ کفر کر!‘‘

﴿فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكَ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶﴾

’’پھر جب وہ کفر کا ارتکاب کر لیتا ہے تو وہ (شیطان) کہتا ہے کہ مَیں تم سے لاتعلق ہوں‘ مَیں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے۔‘‘

آیت ۱۷ ﴿فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ﴾ ’’تو ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ آگ میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔‘‘

﴿وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۷﴾ ’’اور یہی ہے بدلہ ظالموں کا۔‘‘

انسان اور شیطان کی اس ''جوڑی'' کا ذکر سورۃ قٓ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ کسی کافر‘ مشرک اور گنہگار کا جو قرین (ساتھی) شیطان ہو گا وہ اس کے بارے میں کیا کہے گا: ﴿وَ قَالَ قَرِیۡنُہٗ ہٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ ﴿۲۳﴾﴾ ''اور اس کا ساتھی کہے گا: (اے پروردگار!) یہ جو میری تحویل میں تھا‘ حاضر ہے!'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملے گا: ﴿اَلۡقِیَا فِیۡ جَہَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیۡدٍ ﴿۲۴﴾﴾ ''جھونک دو جہنّم میں ہر ناشکرے سرکش کو''۔ اس کے بعد کی دو آیات میں اس جہنمی کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ شیطان پھر کہے گا: ﴿رَبَّنَا مَاۤ اَطۡغَیۡتُہٗ وَ لٰکِنۡ کَانَ فِیۡ ضَلٰلٍۭ بَعِیۡدٍ ﴿۲۷﴾﴾ ''پروردگار! مَیں نے اس کو گمراہ نہیں کیا‘ بلکہ یہ خود ہی بہت بڑی گمراہی میں مبتلا تھا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ﴿لَا تَخۡتَصِمُوۡا لَدَیَّ وَ قَدۡ قَدَّمۡتُ اِلَیۡکُمۡ بِالۡوَعِیۡدِ ﴿۲۸﴾ مَا یُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَیَّ وَ مَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۲۹﴾﴾ ''اب میرے سامنے جھگڑو مت‘ جبکہ میں پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا ہوں۔ میرے حضور میں بات تبدیل نہیں کی جا سکتی اور مَیں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔''

آیات ۱۸ تا ۲۴

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ لۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ
وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا
کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۹﴾
لَا یَسۡتَوِیۡۤ اَصۡحٰبُ النَّارِ وَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ؕ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہُمُ
الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾ لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا
مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ ؕ وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ
لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ہُوَ اللّٰہُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ عٰلِمُ
الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ ۚ ہُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ ﴿۲۲﴾ ہُوَ اللّٰہُ الَّذِیۡ لَاۤ
اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلۡمَلِکُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُہَیۡمِنُ الۡعَزِیۡزُ
الۡجَبَّارُ الۡمُتَکَبِّرُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ہُوَ اللّٰہُ الۡخَالِقُ
الۡبَارِئُ الۡمُصَوِّرُ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۲۴﴾

اب ہم اس سورت کے تیسرے اور آخری رکوع کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں جو بہت اہم آیات پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ جب قرآن مجید کے کسی مقام یا کسی آیت کی خصوصی اہمیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اس مقام یا آیت کا کوئی خاص پہلو یا خاص موضوع مراد ہوتا ہے‘ ورنہ قرآن مجید کا تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اہم ہے۔ مثلاً قرآن مجید کے بعض مقامات فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے اہم ہیں تو بعض دوسرے مقامات سائنسی حوالے سے لائقِ توجہ ہیں۔ بعض آیات روحِ دین سے بحث کرتی ہیں تو بعض ایمان کی ماہیت واضح کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر آیت اور ہر مقام کی اہمیت اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی اہمیت فلسفہ اور تصوّف کے موضوع کی وجہ سے بھی ہے اور اسمائے حسنیٰ کے اس عظیم الشان گلدستے کے اعتبار سے بھی جو پورے قرآن میں بالکل یکتا اور منفرد ہے۔ اس سورت کی آخری تین آیات اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذکر کے حوالے سے سورۃ الحدید کی ابتدائی چھ آیات کے ہم وزن ہیں۔ ان تین آیات میں ایک ساتھ سولہ اسمائے حُسنیٰ آئے ہیں اور ان میں سے آٹھ اسمائے حُسنیٰ تو ایک ہی آیت میں ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں اسمائے حُسنیٰ کے ایک مقام پر اکٹھے ہونے کی اور کوئی مثال قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

آیت ۱۸ ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ لۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ﴾

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اُس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے!''

ظاہر ہے یہ اُس کل کے دن کی بات ہے جو بعث بعد الموت کے بعد آنے والا ہے‘ جس دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہو گا۔ اس دن کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر اہلِ ایمان اپنی زندگی اللہ کے تقویٰ کے سائے میں گزارنے کا اہتمام کرے اور اپنے اعمال کا مسلسل جائزہ لیتا رہے کہ اُس نے آخرت کے حوالے سے اب تک کیا کمائی کی ہے اور کائناتی حکومت کے امپیریل بینک میں اپنے کل کے لیے اب تک کتنا سرمایہ جمع کرایا ہے۔

﴿وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘ یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں بنیادی طور پر دو باتوں پر زور دیا گیا ہے: اللہ کا تقویٰ اور فکرِ آخرت۔ بلکہ اِتَّقُوا اللّٰہَ کا حکم یہاں خصوصی تاکید کے طور پر دو مرتبہ آیا ہے۔ تقویٰ سے عام طور پر اللہ کا خوف اور ڈر مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں یہ اہم نکتہ ضرور مدّنظر رہنا چاہیے کہ اس خوف میں شیر یا سانپ کے خوف کی طرح دہشت کا عنصر بالکل نہیں، بلکہ اس کی مثال ایسے خوف کی سی ہے جیسا خوف سعادت منداولاد اپنے والد سے محسوس کرتی ہے۔ اس خوف میں محبت اور احتیاط کے جذبات غالب ہوتے ہیں کہ ہمارے والد ہم سے ناراض نہ ہوجائیں اور ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ہمارے والد کے جذبات و احساسات مجروح ہوں۔ چنانچہ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ڈر رہے —— تقویٰ کے لغوی معنی بچنے کے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ بچ کر زندگی گزارنا۔

آیت ۱۹ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ ”اور (اے مسلمانو دیکھنا!) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔“

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹﴾ ”یہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں۔“

ہمارے لیے اس آیت کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنا فلسفہ خودی اسی آیت سے اخذ کیا تھا۔ علامہ کے اس بیان کے راوی سیّد نذیر نیازی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے ایک واقعہ رقم کیا ہے۔ (یہ واقعہ انہوں نے ہمارے ہاں قرآن کانفرنس میں اپنے ایک لیکچر میں بھی بیان کیا تھا۔) وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے علامہ اقبال سے ان کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے فلسفہ خودی کے ماخذ کے بارے میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی ہیں۔ کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ آپ نے یہ فلسفہ نطشے سے لیا ہے، کوئی اس حوالے سے کسی دوسرے مغربی فلاسفر کا نام لیتا ہے۔ بہتر ہوگا آپ خود واضح فرما دیں کہ آپ کے اس فلسفہ کا ماخذ کیا ہے؟ یہ سن کر علامہ اقبال نے انہیں فرمایا کہ آپ کل فلاں وقت میرے پاس آئیں، مَیں آپ کو اس کے ماخذ کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے کہ شاعر مشرق اور حکیم الامت انہیں یہ اعزاز بخش رہے ہیں کہ انہیں اس موضوع پر تفصیلی ڈکٹیشن دیں گے۔ لیکن اگلے دن جب وہ کاپی پنسل ہاتھ میں لیے

مقررہ وقت پر حاضر خدمت ہوئے تو علامہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ ذرا قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ پھر انہوں نے کہا کہ سورۃ الحشر کی یہ آیت (آیت ۱۹) نکال کر تلاوت کرو! اور انہیں مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ہے میرے فلسفہ خودی کا ماخذ!

اب آیئے فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ کے مفہوم پر غور کریں۔ کیا کوئی شخص اپنے آپ کو اس طرح بھول سکتا ہے کہ وہ خود اپنی شخصیت سے ہی واقف نہ رہے؟ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہوسکتا ہے جسے اپنے پیٹ کا خیال نہ رہے؟ یا جسے اپنی کوئی بیماری یاد نہ رہے؟ ظاہر ہے کوئی انسان اپنے جسم اور اس کے تقاضوں سے غافل نہیں ہوسکتا۔ تو معلوم ہوا کہ حیوانی جسم کے علاوہ انسان کی کوئی اور حیثیت بھی ہے جسے وہ بھول جاتا ہے اور وہ ہے انسان کی اصل حقیقت یعنی اس کی ”روح“۔ جہاں تک انسان کے اللہ کو بھلانے کا تعلق ہے اس کا ذکر سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۹ میں بھی آیا ہے: ﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ﴾ ”شیطان نے ان پر قابو پا لیا ہے، پس انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے“۔ اب آیت زیر مطالعہ میں ایسے لوگوں کی اس سزا کا ذکر ہے جو انہیں دنیوی زندگی میں ہی مل جاتی ہے۔ یعنی جو لوگ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ کو بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی اصل حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ انسان ہیں، اشرف المخلوقات ہیں یا اللہ کے بندے ہیں۔ انہیں بس یہی یاد رہ جاتا ہے کہ بہت سے حیوانات کی طرح وہ بھی ایک حیوان ہیں۔

آج ہماری جدید تہذیب بھی مختلف انداز سے ہمیں یہی سبق پڑھانے کی کوشش میں ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے۔ اس فلسفے کو متعارف کرانے اور پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ڈارون کے نظریہ ارتقاء (Evolution Theory) نے ادا کیا ہے۔ اس تھیوری کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حیوان اور انسان میں بنیادی فرق صرف ارتقاء کے مراحل اور مدارج کا ہے۔ جیسے گدھے اور گھوڑے میں صرف یہ فرق ہے کہ گدھا نچلے درجے کا (rough & coarse) جانور ہے، جبکہ گھوڑا ارتقاء کا ایک مزید مرحلہ طے کر کے نسبتاً بہتر درجے میں چلا گیا ہے اور ایک refined اور تمکنت والا جانور ہے، اسی طرح کا فرق ایک گوریلے (chimpanzee) اور انسان میں ہے۔ یعنی گوریلے کے مقابلے میں انسان نسبتاً بہتر قسم کا جانور ہے، باقی ان دونوں کے جبلی تقاضے (instincts) اور محرکات (motives) میں کوئی فرق نہیں ہے —— جدید سائیکالوجی بھی انہی خطوط پر چل رہی ہے۔ چنانچہ آج کے سائیکالوجسٹ کو بھی محرکاتِ عمل کے

حوالے سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ تو جب یہ فرق مٹ گیا اور انسان اپنی اصلیت کو بھلا کر حیوان بن گیا تو گویا وہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے بھی آزاد ہو گیا۔ انیسویں صدی کے فرنچ لٹریچر میں بنیادی طور پر اسی نکتے کو فوکس کیا گیا ہے کہ حیوانات کی زندگی فطرت کے عین مطابق ہے‘ اس لیے ہم انسانوں کو اُن سے سبق لیتے ہوئے اپنی زندگی کو خواہ مخواہ کے تکلفات سے آزاد کر لینا چاہیے۔ مثلاً تمام حیوانات لباس سے بے نیاز ہیں‘ اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس فطرت کا تقاضا نہیں ہے‘ انسان کی اپنی ایجاد ہے۔ اسی طرح بیوی‘ بیٹی اور ماں کی تمیز بھی حیوانات میں نہیں پائی جاتی‘ یہ پابندی بھی انسان نے اپنے اوپر خود ہی عائد کی ہے۔ یہ ہے آج کے انسان کا المیہ!

بہرحال یہ آیت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ جو انسان اللہ کو بھلا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اُس کی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے۔ انسان کی روح خود اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پھونکی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ ”انسان“ کے مرتبے پر فائز ہوا ہے۔ چنانچہ جب کوئی انسان اپنی روح اور اس کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ انسان کے درجے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ اس حوالے سے اپنشد کا یہ جملہ بہت اہم ہے:

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheeths that encompass his real self."

اسی real self کا دوسرا نام ”انا“ ہے‘ لیکن اس سے اصل مراد انسان کی ”روح“ ہی ہے‘ جسے علامہ اقبال نے فلسفیانہ انداز میں ”خودی“ کا نام دیا ہے:

؎ نقطۂ نُوری کہ نامِ او خودی ست
زیر خاکِ ما شرارِ زندگی ست

؎ ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حیوانی جسم اور روح کا مرکب ہے۔ بقول شیخ سعدی:

آدمی زادہ طرفہ معجون است — از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یعنی آدمی ایک ایسی معجونِ مرکب ہے جس میں فرشتہ اور حیوان دونوں گندھے ہوئے ہیں۔ فرشتے سے مراد یہاں وہ نورانی روح ہے جو عالمِ امر کی چیز ہے: ﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ

الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾﴾ (بنی اسرائیل) ”اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں۔ آپ فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا علم مگر تھوڑا سا“۔ چنانچہ انسان کی روح نورانی چیز ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اگر انسان اللہ کو بھلا دے گا تو اپنی روح یعنی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو کر محض ایک حیوان بن کر رہ جائے گا۔ اس کے بعد اس کی نظر میں اچھے بُرے اور حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں رہے گی۔ انسانی معاشرے کے ایسے ہی افراد آیت زیر مطالعہ کے حکم ”اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ“ کے مصداق ہیں۔

آیت ۲۰ ﴿لَا یَسۡتَوِیۡۤ اَصۡحٰبُ النَّارِ وَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ؕ﴾ ”(دیکھو!) برابر نہیں ہو سکتے آگ والے اور جنّت والے۔“

﴿اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾ ”یقیناً جنّت والے ہی کامیاب ہوں گے۔“

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ اَدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَبْرَارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ، یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ!

آیت ۲۱ ﴿لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ ؕ﴾ ”اگر ہم اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔“

یہ قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے یہاں یہ اہم نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید کی عظمت اور قرآن مجید کی افادیت دو الگ الگ موضوعات ہیں‘ ان دو موضوعات کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں تک قرآن مجید کی افادیت کا تعلق ہے‘ قرآن کی متعدد آیات اس حوالے سے ہماری راہنمائی کرتی ہیں‘ لیکن سورۂ یونس کی یہ دو آیات اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں:

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۬ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

”اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے

سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔

(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے‘ تو چاہیے کہ لوگ اس پر خوشیاں منائیں! وہ کہیں بہتر ہے ان چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔‘‘

یہ تو قرآن مجید کی افادیت کا ذکر ہے‘ لیکن قرآن مجید فی نفسہٖ کیا ہے؟ انسان کا محدود ذہن اس موضوع کو کماحقہٗ سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی عظمت کے تصوّر کو انسانی ذہن کے لیے کسی حد تک قابلِ فہم بنانے کے لیے آیت زیر مطالعہ میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس تمثیل کو سمجھنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر پیش آنے والے واقعہ کی یاد دہانی ضروری ہے۔ یہ واقعہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چالیس راتوں کے لیے کوہِ طور پر گئے تو آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ﴾ کہ اے میرے رب! مجھے اپنا جلوہ دکھا‘ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ﴿قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ ﴿وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ﴾ البتہ تم اس پہاڑ کو دیکھو‘ میں اپنی تجلّی اس پر ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ﴾ تو اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ قائم رہ سکا تو پھر تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ﴾ پھر جب اُس کے ربّ نے پہاڑ پر ایک تجلی ڈالی‘ یعنی نور کا پرتو جب پہاڑ پر پڑا تو ﴿جَعَلَہٗ دَکًّا﴾ اُس نے اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ﴿وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا ۚ﴾ (الاعراف:۱۴۳) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بالواسطہ تجلّی کے مشاہدہ کی تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش کر گر پڑے۔ اس واقعہ کے ساتھ آیت زیر مطالعہ میں بیان کی گئی تمثیل کی گہری مماثلت ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ کوہِ طور پر ''تجلّیٔ ذات'' کا معاملہ تھا اور یہاں اس تمثیل میں ''تجلّیٔ صفات'' کا ذکر ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام اپنے متکلّم کی صفت ہوتا ہے۔ اس لیے جو تاثیر ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلّی کی ہے عین وہی تاثیر کلام اللہ کی تجلّی کی ہے۔ علامہ اقبال اپنے انداز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان یوں کرتے ہیں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

کہ اگر مَیں اپنے دل کی بات کروں تو یہ کہوں گا کہ قرآن مجید محض ایک کتاب نہیں ہے بلکہ کوئی اور

ہی چیز ہے۔ کیا چیز ہے؟ اس کی مزید وضاحت علامہ یوں کرتے ہیں:

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں   زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

یعنی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا حامل ہے اور اس حیثیت میں یہ پوشیدہ بھی ہے اور عیاں بھی۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا بھی ہے اور گویا (بولتا ہوا) بھی۔ قرآن حکیم کی عظمت کے حوالے سے سورۃ الواقعہ کی آیت ﴿لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ ﴿ؕ۷۹﴾﴾ کی تشریح کے تحت یہ نکتہ بھی زیر بحث آ چکا ہے کہ قرآن مجید کی حقیقی معرفت‘ اصل ہدایت اور روحِ باطنی تک رسائی کے لیے انسان کے باطن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطن کا تجزیہ کیے بغیر قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ صرف اس کی عبارت اور لغت کے ظاہری مطالب و معانی تک ہی رسائی حاصل کر پائے گا۔

﴿وَ تِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ غور کریں۔''

اب وہ تین عظیم آیات آ رہی ہیں جن کا ذکر اس رکوع کے آغاز میں اسمائے حُسنیٰ کے حوالے سے ہوا تھا۔ واضح رہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے موضوع پر سورۃ الحدید کی پہلی چھ آیات قرآن مجید کے ذروۂ سنام کا درجہ رکھتی ہیں۔ (عربی میں اونٹ کی کوہان کو سنام اور کسی چیز کی چوٹی یا بلند ترین حصّے کو ذُروہ/ذِروہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ذروۂ سنام کا مطلب ہے کوہان کی بھی چوٹی۔ یعنی سب سے اونچا مقام یا کسی چیز کا نمایاں ترین حصّہ!) جبکہ اسمائے حُسنیٰ کے ذکر کے اعتبار سے سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پورے قرآن میں منفرد و ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے حوالے سے یہاں ''ایمانِ مجمل'' کے یہ الفاظ بھی اپنے حافظے میں تازہ کر لیں: اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے تمام اَسماء و صفات کے ساتھ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے تمام احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

آیت ۲۲ ﴿ہُوَ اللّٰہُ الَّذِیۡ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ﴾ ''وہی ہے اللہ‘ جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''

﴿عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ ۚ﴾ ''وہ جاننے والا ہے چھپے کا اور کھلے کا۔''

یہ پورا مرکب اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے جو ہمارے سامنے ہے اور اُسے بھی جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیجیے کہ قرآن میں

جہاں اللہ کے لیے غیب اور شہادۃ کے الفاظ آتے ہیں‘ وہ ہم انسانوں کے لیے ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے لیے تو سب شہادہ ہی شہادہ ہے‘ اُس کے لیے تو کوئی چیز بھی غیب نہیں۔ ہم انسانوں کے لیے کچھ چیزیں تو وہ ہیں جنہیں ہم اپنے حواسِ خمسہ سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسی تمام اشیاء ہمارے لیے ’’ظاہر‘‘ (الشَّهَادَة) کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی چیز کو ہم مائیکرو سکوپ یا ٹیلی سکوپ سے بھی دیکھ لیں تو اس کی حیثیت بھی ہمارے لیے ’’ظاہر‘‘ ہی کی ہے۔ دوسری طرف کچھ ایسے حقائق ہیں جنہیں ہم سے چھپا دیا گیا ہے‘ انہیں ہم کسی طرح بھی اپنے حواس کے احاطہ میں نہیں لا سکتے۔ ایسی سب چیزیں ہمارے لیے غیب کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات‘ فرشتے‘ جنّت‘ دوزخ‘ عالَمِ آخرت وغیرہ‘ سب ہمارے لیے غیب ہیں۔ یہ مضمون سورۃ الجن میں دوبارہ واضح تر انداز میں آئے گا۔

﴿هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾﴾ ’’وہ بہت رحم کرنے والا‘ نہایت مہربان ہے۔‘‘

سورۃ الفاتحہ کی دوسری آیت ان ہی دو اسمائے حُسنیٰ پر مشتمل ہے۔ لغوی اور اشتقاقی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو متعلقہ آیت کی تشریح۔

آیت ۲۳ ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ﴾ ’’وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔‘‘
﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ﴾ ’’حقیقی بادشاہ‘ یکسر پاک‘ سراپا سلامتی (اور ہر اعتبار سے سالم)‘ امن دینے والا‘ پناہ میں لینے والا‘ زبردست (مطلق العنان)‘ اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا‘ سب بڑائیوں کا مالک۔‘‘
﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ ’’اللہ پاک ہے اُن تمام چیزوں سے جو یہ شرک کرتے ہیں۔‘‘

اس ایک آیت میں آٹھ اسمائے حُسنیٰ مسلسل‘ بغیر حرفِ ’’و‘‘ کے آئے ہیں اور اس لحاظ سے یہ آیت پورے قرآن مجید میں منفرد ہے۔

آیت ۲۴ ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ ’’وہی ہے اللہ‘ تخلیق کا منصوبہ بنانے والا‘ وجود بخشنے والا‘ صورت گری کرنے والا۔‘‘

اس آیت میں (اللہ کے علاوہ) تین اسمائے حُسنیٰ آئے ہیں۔ ان تینوں اسماء کا تعلق تخلیقی عمل کے مختلف مراحل سے ہے اور اس لحاظ سے یہاں ان کا ذکر ایک فطری اور منطقی ترتیب سے ہوا

ہے۔ ’’خلق‘‘ دراصل عملِ تخلیق کا وہ مرحلہ ہے جب کسی چیز کا منصوبہ یا نقشہ تیار ہوتا ہے۔ بغرضِ تفہیم اگر ہم انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے ایک بڑھئی کی مثال سامنے رکھیں تو عملِ تخلیق کے مختلف مراحل اور ان تینوں اسماء کے مابین پائے جانے والے خاص ربط کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ فرض کریں کہ بڑھئی ایک میز بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے وہ مطلوبہ سائز اور مطلوبہ شکل کی میز کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ یہ اس میز کی ذہنی تخلیق ہے۔ اس کے بعد بڑھئی مجوزہ نقشے کے مطابق لکڑی کا میز بنا کر اپنی ’’ذہنی تخلیق‘‘ کو عالَمِ واقعہ میں ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر تیسرے اور آخری مرحلے میں وہ اسے finishing touches دیتے ہوئے رنگ و روغن کر کے میز کو حتمی طور پر تیار کر دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں اسمائے حُسنیٰ کا تعلق تخلیق کے ان ہی تین مراحل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کا ایک نقشہ یا نمونہ تیار فرماتا ہے۔ اس مفہوم میں وہ الْخَالِقُ ہے‘ پھر وہ اس تخلیق کو عدم سے عالَمِ وجود میں ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ البَارِئُ ہے۔ (بَرَأَ کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۲ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ ’’اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کریں۔‘‘) اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کو باقاعدہ ایک صورت یا شکل عطا کرتا ہے۔ اس معنی میں وہ ’’الْمُصَوِّر‘‘ ہے۔

﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ﴾ ’’تمام اچھے نام اُسی کے ہیں۔‘‘
﴿يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ’’اُسی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔‘‘
﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٤﴾﴾ ’’اور وہ بہت زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔‘‘

اس سورت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے آغاز میں بھی اللہ کی تسبیح کا بیان ہے اور اس کا اختتام بھی اللہ کی تسبیح پر ہوتا ہے۔ آغاز میں تسبیح کے حوالے سے ماضی کا صیغہ (سَبَّحَ) آیا ہے جبکہ اختتام پر مضارع کا صیغہ (يُسَبِّحُ) ہے۔ اسی طرح اس کی ابتدائی آیت کے اختتام پر جو دو اسمائے حُسنیٰ (الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ) آئے ہیں‘ آخری آیت کا اختتام بھی ان ہی اسمائے حُسنیٰ پر ہوتا ہے۔

❁❁❁

آخری صلیبی جنگ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

۲ر ستمبر ۲۰۰۵ء کا خطابِ جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علی رَسولہِ الکریم ... امّا بعد:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾﴾ (المائدۃ)

آج مجھے آخری صلیبی جنگ کے موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ یہ موضوع انتہائی اہم بھی ہے اور اس میں ہمارے لیے غور و فکر کا بہت سا سامان بھی موجود ہے۔

گفتگو کے آغاز میں چند بنیادی باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ اصطلاح یعنی ’’آخری صلیبی جنگ‘‘ میری نہیں ہے‘ بلکہ عیسائیوں کے ایک فرقے Baptists کی ہے‘ جو کہ پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں اور ان میں سے بھی جو اَخص الخواص ’’Evangelists‘‘ ہیں‘ ان کے میگزین ’’فلاڈلفیا ٹرمپٹ‘‘ میں ’’The Last Crusade‘‘ کے عنوان سے جیرالڈ فلری کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔

اس مقالے کا ایک اقتباس کچھ یوں ہے:

> *"Most people think the crusades are a thing of the past-over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all!"*

’’بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگیں ماضی کی بات ہے اور ختم ہو چکی ہیں‘

لیکن ان کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ آخری صلیبی جنگ کے لیے تیاریاں جاری ہیں اور یہ انتہائی خونی جنگ ہوگی۔‘‘

اس مضمون کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخِ انسانی کو تین ادوار میں تقسیم کرنا ہوگا:

۱) پہلا ملینیم: ۳۰ء سے ۱۰۰۰ء تک

۲) دوسرا ملینیم: ۱۰۰۱ء سے ۱۹۹۹ء تک

۳) تیسرا ملینیم: ۲۰۰۰ء سے اَب تک (جاری)

یہاں پر یہ واضح رہے کہ ’’ملینیم‘‘ کی اصطلاح جو عیسائی اور یہودی استعمال کرتے ہیں‘ وہ آسمانی کتابوں کے عین مطابق ہے۔ قرآن مجید میں دو بار ارشاد ہوا کہ ’’اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزار برس پر محیط ہے۔‘‘ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں:

﴿وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾﴾

’’اور ایک دن تمہارے ربّ کے یہاں ہزار برس کے برابر ہوتا ہے جو تم گنتے ہو۔‘‘

اسی طرح سورۃ السجدۃ میں ارشاد ہوا:

﴿یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾﴾

’’وہ تدبر سے اُتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک‘ پھر چڑھتا ہے وہ کام اُس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں۔‘‘

پہلے ملینیم کے آغاز پر صورتِ حال یہ تھی کہ یروشلم جو کہ یہودیوں کا شہر تھا اور یہاں وہ ایک عرصے سے آباد تھے‘ یہیں پر ان کا ہیکل سلیمانی (Solomon's Temple) بھی تھا‘ جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا تھا اور ۵۸۷ ق م میں اسے عراقی بادشاہ بخت نصر (Nebukadnezar) نے منہدم کر دیا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اسے انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا تھا‘ لیکن ۷۰ء میں طیطس (Titus) نامی ایک رومی جرنیل نے حملہ کیا جس میں یہودیوں کو بڑی خوفناک شکست ہوئی۔ اس قدر خون ریزی ہوئی کہ ٹائٹس رومی نے صرف ایک دن میں کم و بیش ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور جو ’’ہیکل ثانی‘‘ انہوں نے تعمیر کیا تھا وہ بھی مسمار کر دیا۔ یہودیوں کے نزدیک ہیکل سلیمانی

کی وہی اہمیت ہے جو ہمارے نزدیک کعبہ کی ہے اور آج ۱۹۳۵ برس ہونے کو آئے ہیں لیکن ان کا یہ کعبہ اب تک گرا پڑا ہے۔ ٹائٹس رومی کے ہاتھوں قتل عام کے بعد جو یہودی بچ گئے انہیں فلسطین کے علاقے سے نکال دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا اور یروشلم یہودیوں سے کُلّی طور پر خالی ہو گیا۔ فلسطین سے انخلا کے اس دَور کو یہودی بجا طور پر اپنا ''دورِ انتشار'' (Diaspora) کہتے ہیں۔

اس واقعہ کے تقریباً ۶۰۰ برس بعد حضرت عمر فاروق ؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا' اُسی میں مسلمانوں نے یروشلم پر بھی حملہ کیا' جو اُس وقت عیسائیوں کے قبضہ میں تھا۔ اس شہر کی فصیلیں بے انتہا اونچی تھیں اور اندر راشن بھی وافر مقدار میں موجود تھا۔ چنانچہ عیسائیوں نے فصیلوں کے دروازے مقفل کر دیے اور خود اندر محصور ہو گئے۔ نتیجتاً ایک طویل محاصرے کے بعد بھی مسلمانوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اسی دوران عیسائیوں کے چند بڑے عالم فصیل پر آئے اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''تم ہزار برس تک بھی یہاں پڑے رہو گے تب بھی تمہارے ہاتھ پر یہ شہر فتح نہیں ہو گا۔ ہاں ہماری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ اسے ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہونا ہے' لیکن تمہارے درمیان وہ درویش بادشاہ نظر نہیں آ رہا''۔ اس بات کا پس منظر سمجھ لیجیے۔ اسلام کا اوّلین دَور مسلمانوں کے لیے غربت اور افلاس کا دَور تھا۔ بعد ازاں فتوحات کے نتیجے میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اُس سے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے اور اب انہوں نے شامیوں کے سے انداز میں اچھا لباس استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ مسلمان کافی عرصہ سے شام میں تھے' لہٰذا شامی تہذیب کا اثر اُن کے رہن سہن میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔

عیسائی عالموں کی بات سے امیر لشکر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح ؓ (جنہیں رسول اللہ ﷺ کی زبان میں اَمِیۡنُ ھٰذِہِ الۡاُمَّۃِ کا لقب ملا تھا) کو خیال ہوا کہ ان کا اشارہ یقیناً حضرت عمر فاروق ؓ کی طرف ہے۔ لہٰذا محاذِ جنگ سے حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک درخواست روانہ کی گئی کہ اگر آپ خود تشریف لائیں گے تو یروشلم بغیر لڑائی کے فتح

ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ خود یروشلم روانہ ہوئے۔ یہ وہی تاریخی سفر ہے جو اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی روشن باب ہے۔ اس سفر میں صرف ایک سواری (اونٹ) تھی۔ راستے کے لیے راشن بھی اسی پر لدا ہوا تھا۔ لہٰذا ایک وقت میں ایک آدمی ہی اُس پر بیٹھ سکتا تھا۔ اندریں حالات ایک منزل میں خلیفہ سواری کے اوپر تشریف فرما ہوتے اور آپؓ کا خادم نکیل ہاتھ میں پکڑے آگے آگے چلتا' اگلی منزل پر خادم سواری کے اوپر بیٹھتا اور خلیفۂ وقت نکیل تھامے آگے چل رہے ہوتے۔ مساوات کا یہ عملی نمونہ تاریخ انسانی نے کم کم ہی دیکھا ہو گا۔ جب آخری منزل شروع ہوئی تو اتفاق سے سواری پر بیٹھنے کی باری خادم کی تھی۔ اُس نے بہت اصرار کیا کہ آپؓ اونٹ پر بیٹھ جایئے' لوگ کیا کہیں گے' لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں' باری تمہاری ہے' لہٰذا تمہیں ہی اونٹ پر بیٹھنا ہو گا۔ لہٰذا جب یروشلم میں داخل ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ خلیفۂ وقت جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوان کانپتے تھے' اس شان سے چلے آ رہے ہیں کہ ایک ہاتھ میں اُونٹ کی نکیل ہے اور دوسرے ہاتھ میں اپنے جوتے پکڑے ہوئے ہیں' جبکہ خادم سواری کے اوپر بیٹھا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح ؓ نے آپؓ کا استقبال کیا اور اسی طرح سیدھے آپؓ کو فصیل کے قریب لے گئے اور عیسائیوں کو پکار کر کہا کہ یہ ہیں ہمارے خلیفہ! عیسائیوں نے اپنی کتابوں کے مطابق جو نشانیاں ملائیں تو اس بات پر صاد کیا کہ یہی وہ بادشاہ ہیں جن کے ہاتھ پر یہ شہر فتح ہونا ہے۔ لہٰذا فصیل کے دروازے کھول دیے گئے۔ مسلمان افواج اندر داخل ہو گئیں اور یروشلم بغیر کسی لڑائی کے مسلمانوں نے فتح کر لیا۔

اس موقع پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے وقت عیسائیوں کا یہ مطالبہ مان لیا گیا کہ یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ حضرت عمر ؓ نے یہ طے فرما دیا کہ یروشلم یہودیوں کے لیے کھلا شہر (open city) تو ہو گا تاکہ وہ یہاں آ کر اپنے مقدس مقامات کی زیارت کریں' لیکن نہ تو وہ یہاں آباد ہو سکیں گے اور نہ ہی کوئی جائیداد وغیرہ خرید سکیں گے۔ یہ تھے وہ اہم واقعات اور حالات جو پہلے ملینیم کے دوران پیش آئے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم پہلے ملینیم کے اختتام پر اُس واقعہ کی طرف بڑھتے ہیں جو کہ انتہائی اہم ہے‘ اور وہ واقعہ تھا پورے عالم عیسائیت کا اتحاد۔ اس واقعہ سے پیشتر عیسائی دنیا کئی سو برس سے دو حصوں میں منقسم تھی۔ مذہبی اعتبار سے اٹلی‘ فرانس‘ جرمنی‘ سپین اور انگلستان کے علاقوں پر مشتمل عیسائیت مغربی عیسائیت کہلاتی تھی‘ جس کا سربراہ پوپ تھا اور اس کا صدر مقام روم (رومۃ الکبریٰ) تھا۔ اس کے برعکس دوسرا حصّہ جو جنوب مشرقی یورپ اور مشرقی یورپ کے عیسائی ممالک پر مشتمل تھا۔ یہاں کی عیسائیت مشرقی عیسائیت کہلاتی تھی۔ اس کا صدر مقام قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔ دونوں حصّوں کے اتحاد کے بعد پوپ کو عیسائی دنیا کے مرکزی رہنما کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

دوسرے ملینیم کے شروع ہونے کے ٹھیک ۹۵ برس بعد یعنی ۲۰ نومبر ۱۰۹۵ء کو اُس وقت کے پوپ اربن ثانی (Urban-II) نے فرانس کے شہر Clermont میں ایک انتہائی اہم خطاب کیا‘ جس میں اُس نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ’’ہمارا یہ اہم ترین مذہبی فریضہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جہاد کریں اور ان سے اپنے مقدّس مقامات چھین لیں۔‘‘ پہلے ملینیم کے اختتام پر فلسطین اور شام کے علاقے بشمول یروشلم مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ اس علاقے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

Too small a geography but too big a history.

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں تینوں ابراہیمی مذاہب یعنی یہودیت‘ عیسائیت اور اسلام کے مقدس مقامات ہیں۔ اسی اہمیت کی وجہ سے یہاں تصادم بھی بڑا شدید ہوا۔

پوپ اربن ثانی کی مذکورہ بالا تقریر سے عیسائی دنیا میں ایک آگ لگ گئی۔ چنانچہ پورے یورپ پر مشتمل ایک بہت بڑی فوج تیار کی گئی‘ جس میں قائدانہ کردار فرانس اور جرمنی کا تھا۔ عیسائیوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے اور اس طرح باقاعدہ طور پر جنگ کا آغاز ہوگیا۔ اس جنگ کا سلسلہ ۱۰۹۷ء سے ۱۲۹۱ء تک تقریباً ۱۹۴ برس جاری رہا —— جنگ (war) اور لڑائی (battle) میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک جنگ کئی لڑائیوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ یعنی جنگ تو مسلسل جاری رہتی ہے‘ اس کے اندر بے شمار

لڑائیاں اور معرکے ہوتے رہتے ہیں‘ کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر۔ عام طور پر ہم جنگ کا لفظ بھی لڑائی کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں۔ بہرحال اس طویل جنگ کے دوران سینکڑوں لڑائیاں (battles) ہوئیں‘ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بڑی بڑی جنگیں بھی ۹ یا ۱۳ کی تعداد میں ہوئیں۔ ان جنگوں کو عیسائیوں نے صلیبی جنگوں (The Crusades) کا نام دیا تھا۔

صلیبی جنگوں کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دَور ۱۰۹۷ء سے ۱۱۴۴ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دَور میں عیسائیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا‘ کیونکہ انہیں بتایا گیا تھا کہ اگر اس مقدس جنگ میں تمہاری جان بھی چلی گئی تو تم سیدھے جنّت میں جاؤ گے اور تمہارے تمام گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ جہاد کے ضمن میں آج مسلمانوں کو جس طرح بدنام کیا جا رہا ہے‘ اس سے کہیں زیادہ قابلِ مذمت ’’جہاد‘‘ کا وہ نعرہ تھا جو پوپ اربن ثانی نے ۱۰۹۵ء میں لگایا تھا۔ بہرحال لاکھوں کی تعداد میں عیسائی افواج ایشیا کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستے میں جو بھی بستیاں آئیں وہ لوٹ لی گئیں۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ رکھیے کہ عیسائیوں کا اصل ہدف تو وہ مسلمان تھے جن کے علاقوں میں ان کے مقدس مقامات تھے۔ ان علاقوں کو مسلمانوں سے بازیاب اور واگزار کرانا ان کا ہدف تھا‘ لیکن ساتھ ہی عیسائیوں کو یہودیوں پر بھی بے پناہ غصہ تھا‘ جو حضرت مسیح علیہ السلام کو ’نعوذ باللہ‘ ولدُ الزنا‘ جادوگر اور شعبدہ باز کہتے تھے۔ چنانچہ اندازہ کیجیے کہ ان کے بارے میں عیسائیوں کے غیظ وغضب کا کیا عالم ہوگا جو حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا‘ الوہیت میں شریک بلکہ خدا تک مانتے ہیں! بہرحال ان لڑائیوں میں جہاں مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا وہاں اَن گنت یہودی بھی مارے گئے۔ جو یہودی بستی بھی راستے میں آئی‘ لوٹ لی گئی اور وہاں قتل وغارت کا بازار خوب گرم ہوا۔ گویا اس صلیبی جنگ میں مسلمان اور یہودی زیر عتاب (persecuted) ہونے کے اعتبار سے یکجا (bracketted) تھے۔

جب یہ واقعات پیش آ رہے تھے‘ عالمِ اسلام پر اُس وقت بنوعباس کی حکومت

تھی۔ یہ اگرچہ قانونی طور پر مرکزی حکومت کہلاتی تھی‘ لیکن بنوعباس اُس وقت کافی کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی سلطنت کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے حکمران پیدا ہو چکے تھے۔ کہیں سلجوقی‘ کہیں بربر‘ کہیں ممالیک اور کہیں کوئی اور تھے‘ اور سب کی اپنی خودمختار حکومتیں تھیں۔ عباسی خلیفہ تو بس ایک علامت (symbol) تھا جس کی آشیرباد حاصل کر کے وہ اپنی حکومت کے لیے سندِ جواز لیتے تھے۔ اِن حالات میں مسلمان کمزوری کی بنا پر اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے‘ نتیجتاً ان کے خلاف عیسائیوں کو بے شمار فتوحات حاصل ہوئیں۔ بحیرۂ روم (Mediterranean) کے ساحلی علاقوں میں‘ جن میں شام‘ فلسطین اور مصر بھی شامل تھے‘ عیسائیوں نے زبردست لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کیا اور ان علاقوں کو فتح کر کے چار آزاد عیسائی ریاستیں قائم کیں۔

ان جنگوں کا دوسرا دَور ۱۱۴۴ء سے ۱۱۹۶ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس دَور میں مسلمانوں کے اندر کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ اسی دوران میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑے مجاہد اور غازی سلطان صلاح الدین ایوبی عیسائیوں کے مقابلے میں آئے اور ۱۱۸۷ء میں انہوں نے صلیبیوں کو شکست دے کر انہیں یروشلم سے نکالا اور وہاں اسلامی حکومت قائم کر دی ___ یروشلم صلیبی جنگ کے پہلے دَور (۱۰۹۹ء) میں عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا تھا اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۸۸ برس بعد اسے واگزار کروایا ___ اسی دوران میں مسلمانوں نے اپنے کچھ مزید علاقے بھی بازیاب کروا لیے۔

ان جنگوں کا تیسرا دَور ۱۱۹۶ء سے ۱۲۹۱ء کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس عرصے میں عیسائیوں کی طرف سے یروشلم دوبارہ فتح کرنے کے لیے پے درپے کوششیں ہوئیں۔ کبھی جرمنی‘ کبھی فرانس اور کبھی دیگر یورپی طاقتوں کی طرف سے فوج کشی کی گئی۔ ایک موقع پر رچرڈ شیر دل (Richard, the Lion-hearted) جو اُس وقت انگلستان کا بادشاہ تھا‘ خود فوج لے کر آیا‘ لیکن اسے بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی اور وہ مجبوراً صلح کر کے واپس چلا گیا۔

اسی دوران میں ایک مرحلے پر سلجوقی بادشاہ الملک کامل کے دَور میں صلیبیوں نے

پھر حملہ کیا اور وہ مقابلہ نہ کر سکا‘ لہٰذا اُس نے معاہدہ کر کے یروشلم دوبارہ عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ اس مرتبہ یروشلم ۱۶ برس تک عیسائیوں کے زیر قبضہ رہا۔ گویا ۱۹۴ برس کی ان صلیبی لڑائیوں میں ۱۰۴ برس تک یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں رہا۔ آخر کار مسلمانوں نے اپنے سارے علاقے دوبارہ بازیاب کرا لیے اور ۱۲۹۱ء میں صلیبی جنگ کا یہ دَور اختتام پذیر ہوا۔ یہ تھا پہلی صلیبی جنگ کے دوران مختلف لڑائیوں اور معرکوں کا ایک مختصر جائزہ۔

جہاں تک دوسری صلیبی جنگ کا معاملہ ہے‘ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شروع ہونے والی ہے‘ لیکن میرے نزدیک یہ پچھلی صدی کے اوائل میں شروع ہو چکی ہے۔ گویا اس جنگ کا آغاز ہوئے قریباً سو برس ہو چکے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی جس میں ترکی کو شکست ہوئی اور اس کے نتیجے میں عظیم سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑے کر دیے گئے اور بالآخر خلافتِ عثمانی ۱۹۲۴ء میں کلیۃً ختم ہو گئی۔ اس جنگ کے دوران جب شام فتح ہوا اور اتحادی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو جنرل ایلن بی نے‘ جو مسلح افواج کی کمان کر رہا تھا‘ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی قبر کو ٹھوکر مار کر کہا تھا: "Saladin, We are again here!" یعنی ۱۱۸۷ء میں تم نے ہمیں شکست دی تھی اور یہاں سے نکال دیا تھا‘ لیکن اب ہم دوبارہ آ گئے ہیں اور اب دوبارہ یہاں ہمارا قبضہ ہے۔ یہ پہلا دَور تھا اس آخری صلیبی جنگ کا جس کو شروع ہوئے قریباً ۹۰ برس ہو چکے ہیں۔

جنگ عظیم اوّل کے دوران ایک بہت بڑی تبدیلی یہ آ چکی تھی کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان ایک عرصہ سے جاری دشمنی ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کے درمیان گہرا گٹھ جوڑ ہو چکا تھا‘ بلکہ صحیح تر معنوں میں عیسائی یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اُن کے آلۂ کار بن چکے تھے۔ اس دوستی کا نتیجہ ۱۹۱۷ء کے اعلانِ بالفور (Balfour) کی صورت میں سامنے آیا‘ جس کے مطابق یہودیوں کو یروشلم میں آباد ہونے کا حق حاصل ہو گیا۔ گویا یہ ایک تحفہ تھا جو عیسائیوں نے یہودیوں کو دیا۔

حضرت عمر فاروق ؓ کے دورِ خلافت میں جب یروشلم فتح ہوا تھا تو مسلمان اور عیسائیوں کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے یہودیوں کو اس بات کی اجازت نہیں تھی

کہ وہ یروشلم میں آباد ہوسکیں یا وہاں کوئی جائیداد وغیرہ خرید سکیں۔ بعد میں آنے والے تمام مسلمان حکمرانوں نے‘ خواہ وہ بنواُمیہ تھے یا بنوعباس یا عثمانی‘ اس معاہدے کی پوری طرح پابندی کی‘ حالانکہ اس دوران میں یہودیوں نے ہرطرح سے کوششیں کیں کہ وہ کسی طریقے سے یروشلم میں آباد ہونے کی اجازت حاصل کرلیں۔ سلطان عبدالحمید خان (عثمانی خلیفہ) کو تو بہت بڑی رشوت پیش کی گئی کہ آپ کے ذمے تمام قرضے معاف کردیے جائیں گے اور آپ کا خزانہ جو آپ کے پیش روؤں کی فضول خرچیوں کی وجہ سے خالی ہو چکا ہے اسے بھی بھر دیا جائے گا‘ لیکن عثمانی خلیفہ کا موقف تھا کہ حضرت عمر فاروق ؓ کے کیے ہوئے معاہدے میں وہ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ بہرحال اعلانِ بالفور کے مطابق یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے کا راستہ کھل گیا۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی ریاست قائم ہوگئی اور یوں یہودیوں اور عیسائیوں کے گٹھ جوڑ پر مہرِ تصدیق ثبت کردی گئی۔

عرب ممالک نے اسرائیل کے قیام پر شدید احتجاج کیا جس کے باعث اسی سال عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں عربوں کو شکست ہوئی اور انہیں بے حد نقصان اٹھانا پڑا۔ تقریباً ۱۹ برس بعد یعنی ۱۹۶۷ء میں مصر‘ شام اور اردن سے اسرائیل کی دوبارہ جنگ ہوئی۔ باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا تینوں ممالک اکٹھے ہو کر اسرائیل کے خلاف میدان میں آئے‘ اس مرتبہ پھر انہیں تباہ کن شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجتاً اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا‘ شام سے جولان کی پہاڑیاں اور اردن سے پورا مغربی کنارہ (West Bank) چھین لیا۔ اس ساری صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب دن بدن کمزور سے کمزور تر اور اسرائیل مضبوط سے مضبوط تر اور طاقتور ہوتا چلا گیا۔

اس تناظر میں موجودہ صورتِ حال کے مطابق معاملات مختلف سمتوں میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طرف تو پورے یورپ کو یورپی یونین کی شکل میں دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے (جیسا پہلی صلیبی جنگ کے دوران ہوا تھا)۔ مزید برآں نیٹو (NATO) کو بھی ازسرِنو منظم اور وسیع کیا جا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب اس ساری سرگرمی (activity) کا

مقصد کیا ہے؟ USSR تو ختم ہو چکا۔ اس مہم جوئی کا مقصد یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ’’اب ہمیں مسلم فنڈامنٹلزم سے نمٹنا ہے!‘‘

اس ساری صورتِ حال میں رومن کیتھولکس تو چاہتے ہیں کہ پورا یورپ متحد ہو کر ایک ملک بنے جس میں ایک خالص عیسائی حکومت قائم ہو اور اس طرح آخری صلیبی جنگ کی طرف پیش قدمی ہو۔ اس ضمن میں عیسائیوں کے پیشِ نظر کیا کیا عزائم ہیں‘ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک آپ کو انڈونیشیا کے جزیرہ مشرقی تیمور کے واقعات میں نظر آ جائے گی۔ مشرقی تیمور انڈونیشیا کا بہت بڑا جزیرہ تھا‘ جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی۔ لہٰذا معمولی سے فساد کا بہانہ بنا کر وہاں رومن کیتھولک حکومت قائم کر دی گئی۔ اسی بنا پر پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے ترجمان رسالے "The Philadelphia Trumpet" کا یہ کہنا ہے کہ پوپ جان پال دوم نے یورپ کے اتحاد کی جس طرح کوششیں کی ہیں وہ مقدس سلطنت روما (Holy Roman Empire) کو ازسرِنو زندہ کرنے کے لیے ہیں تاکہ عیسائی صلیبی جہاد کریں اور حملہ کر کے مشرقِ وسطیٰ میں واقع عیسائیوں کے تمام مقدس مقامات مسلمانوں سے چھین لیں۔

جہاں تک پروٹسٹنٹس کا تعلق ہے وہ یہود کے ساتھ ہیں اور ان کے پیشِ نظر عظیم تر اسرائیل (Greater Israel) کا قیام ہے‘ جو فلسطین‘ عراق‘ شام‘ اردن‘ لبنان کے تمام علاقوں‘ جزیرہ نمائے سینا‘ مصر کے جشن کے علاقہ اور دریائے نیل کے ڈیلٹا (زرخیز شمالی علاقہ)‘ ترکی کے جنوبی حصے اور حجازِ مقدس کے شمالی حصے بشمول مدینہ منورہ پر مشتمل ہو۔ جزیرہ نمائے سینا یہود کے لیے بہت مبارک اور متبرک علاقہ ہے۔ اسی میں کوہِ طور بھی ہے جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام متعدد بار اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور یہیں انہیں تورات عطا کی گئی۔ مصر کا اکثر و بیشتر علاقہ بالکل بنجر اور صحرا ہے۔ صرف دریائے نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ قریباً دس میل اِدھر اور دس میل اُدھر روئیدگی اور ہریاول ہے۔ البتہ شمال میں بحیرۂ روم میں گرنے سے پہلے دریائے نیل کی بہت سی شاخیں ہو جاتی ہیں اور یہ ڈیلٹا کا علاقہ بہت زرخیز ہے۔ یہاں پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو آباد

کیا تھا۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے (بنی اسرائیل) اپنے خاندانوں کے ساتھ یہاں آباد ہو گئے اور کئی سو سال میں ان کی تعداد کئی لاکھ ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی اسرائیل کا مصر سے خروج (Exodus) ہوا اور آلِ فرعون کو غرق کیا گیا تو اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلنے والے یہودیوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ مصر کے جس علاقے میں بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک مقیم رہے‘ اسے بھی وہ گریٹر اسرائیل میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔

فلسطین میں اہم ترین جگہ Temple Mount ہے۔ یہ ایک پہاڑی سی ہے جس کے اوپر ایک مستطیل بنتی ہے جو کہ چاروں طرف سے اٹھی اور اُبھری ہوئی ہموار جگہ ہے اور اس کے اوپر ایک میدان کی شکل بن جاتی ہے۔ اس مستطیل کے اندر مسلمانوں کے دو انتہائی متبرک مقامات ہیں‘ یعنی جنوبی گوشے میں مسجد اقصیٰ اور شمالی گوشے میں قبۃ الصخرۃ (Dome of the Rock) ہے جہاں سے رسول اللہ ﷺ کا آسمانی سفر (معراج) شروع ہوا تھا۔ دراصل یہ ایک پہاڑی تھی جس پر اُموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ایک گنبد تعمیر کروا دیا تھا۔ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ سے پہلے اردن کے پاس تھے۔ اُس وقت اردن کے بادشاہ نے اس گنبد پر ۳۰ ٹن سونے کی پتری چڑھائی تھی۔ اس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا گنبد ہے۔ اسی وقت یہودی اخبارات نے لکھ دیا تھا کہ جب ہم اس کو گرا کر اپنا تیسرا معبد (Third Temple) تعمیر کریں گے تو یہ سونا اس کی تعمیر میں ہمارے کام آئے گا۔ معبد کی تعمیر کے بعد وہ اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت (Throne of David) لا کر رکھنا چاہتے ہیں جو اِس وقت لندن میں پارلیمنٹ سے ملحق گرجا (ویسٹ منسٹر ایبے) میں موجود ہے۔ اس تخت پر حضرت داؤد علیہ السلام اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تاج پوشی ہوئی تھی۔

یہ وہ نکات ہیں جو عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین متفق علیہ ہیں۔ البتہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق جب مذکورہ بالا کام ہو جائیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور اس تخت پر بیٹھ کر حکومت کریں گے۔ اس کے برعکس یہودیوں کے عقیدہ کے

مطابق ان کا ”میسایاح“ (Messiah) جس کے وہ اب تک منتظر ہیں‘ جب آئے گا تو پورے کرۂ ارض پر اس کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں جو پیشین گوئیاں تورات میں تھیں ان کے مصداق حضرت مسیح علیہ السلام تھے‘ لیکن جب وہ آئے تو یہودیوں نے انہیں تسلیم نہیں کیا بلکہ ‘نعوذ باللہ‘ انہیں ولد الزنا‘ جادوگر اور کافر و مرتد قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔

یہودیوں کے مذکورہ بالا پروگرام کو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ خاص طور پر Baptists اور اُن میں سے بھی بالخصوص Evangelists اس مشن میں یہود کے دست و بازو بنے ہوئے ہیں۔ بلی گراہم ان کا ایک بہت بڑا مبلغ اور امپرووائزر تھا‘ جو خدا کا سفیر (Ambassador of God) کہلاتا تھا۔ سابقہ امریکی صدر بش سینئر اس کا مرید تھا‘ اور اِس وقت موجودہ امریکی صدر بش جونیئر اِس بلی گراہم کے بیٹے (فرینکلن گراہم) کا مرید ہے۔ یہ Evangelists اِس وقت پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں سب سے زیادہ فعال اور بائبل کی نشر و اشاعت اور تشریح و توضیح کرنے والے ہیں۔ ان کے بعض شعلہ بیان مقررین نے اپنے ریڈیو اور ٹی وی کے ذاتی چینلز کا وسیع جال پھیلایا ہوا ہے۔ The Philadelphia Trumpet ان کا ترجمان رسالہ ہے۔ یہ رسالہ پوپ جان پال دوم کے بارے میں لکھتا تھا کہ یہ شیطان ہے جو کروسیڈ کی تیاری کر رہا ہے۔

یہ ہے وہ آخری صلیبی جنگ جس کے لیے بساط بچھائی جا رہی ہے اور اس کی خبریں دی ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ رومی (عیسائی) تم پر اَسّی عَلَم لے کر حملہ آور ہوں گے اور اُن میں ہر عَلَم کے نیچے بارہ ہزار فوجی ہوں گے۔ یہ امر انتہائی اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہے کہ موجودہ دَور میں ایک ڈویژن آرمی بارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ گویا ۸۰ ڈویژن فوج سے حملہ ہوگا جس کے لیے تیاریاں جاری ہیں۔ پہلی صلیبی جنگوں میں عیسائی ایک طرف تھے اور ان کا نشانہ مسلمان اور یہودی تھے‘ لیکن اب عیسائی اور یہودی ایک ہوں گے اور ان کا نشانہ مسلمان ہوں گے۔ مسلمانوں کو بہت شدید جانی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اس کی خبریں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے دی ہیں۔

آپ ﷺ نے اس جنگ (الملحمۃ العُظمٰی) کے بارے میں بتایا کہ ایک باپ کے اگر ۱۰۰ بیٹے ہوں گے تو ۹۹ ہلاک ہو جائیں گے‘ صرف ایک بچے گا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اتنی لاشیں گریں گی کہ پوری زمین پٹ جائے گی۔ ایک پرندہ مسلسل اڑتا چلا جائے گا لیکن اسے زمین پر بیٹھنے کے لیے خالی جگہ نہیں ملے گی۔ یہ ہے تباہی کا وہ نقشہ جو آخری صلیبی جنگ کے نتیجے میں سامنے آئے گا!

یہ جنگ اصلاً پچھلی صدی کے اوائل میں شروع ہوئی ہے۔ آج جو صورتِ حال ہمارے سامنے ہے اس کے مطابق یہودیت اور عیسائیت یک جان ہیں‘ بلکہ عیسائی یہودیوں کے آلۂ کار بن چکے ہیں۔ اُمّتِ مُسلمہ انتشار کا شکار ہے۔ وحدتِ ملّی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ اس سارے تناظر میں مسلمان حکمرانوں کا کردار انتہائی مایوس کن بلکہ شرمناک ہے۔ خواہ وہ وردی والے ہوں یا بغیر وردی کے‘ سب کے سب مغربی تہذیب کے دلدادہ اور امریکہ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کی اس کمزوری کی بنا پر امریکہ کا اُن پر شدید دباؤ ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کیا جائے۔ محسوس یہی ہو رہا ہے کہ اس مطالبے پر بالآخر سرِ تسلیم خم ہو جائے گا۔ استنبول میں پاکستانی وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری اور اسرائیلی وزیر خارجہ شلوم کی طے شدہ ملاقات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ وہ ایک طرف مسلم ممالک پر قبضہ جمانے اور گریٹر اسرائیل کے قیام کے خواب دیکھ رہے ہیں جبکہ دوسری طرف مسلمانوں کے مقدس مقامات قبۃ الصخرۃ اور مسجد اقصیٰ کو منہدم کر کے اپنے تیسرے معبد کی تعمیر کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ قبۃ الصخرۃ یا مسجد اقصیٰ کے انہدام پر عرب نوجوانوں کے اندر انتہائی جوش و خروش پیدا ہو جائے گا اور وہ بلبلا کر اٹھیں گے۔ اس کے نتیجے میں پہلے تو خود امریکہ کے ایجنٹ مسلم حکمران ان کی سرکوبی کریں گے‘ جیسے آج ’’القاعدۃ‘‘ کا نام دے کر پوری مسلم دنیا میں مجاہدین کا قلع قمع کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کے بعد انتہائی خوفناک جنگ ہوگی جس میں شدید خون ریزی ہوگی۔ اس میں مسلمان ایک طرف ہوں گے اور یہود و نصاریٰ دوسری طرف۔

قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں جو آیات آئی ہیں‘ ان میں دو مقامات پر بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ یہ دونوں مقامات سورۃ المائدۃ میں ہیں۔ ایک مقام پر فرمایا گیا:

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَہُوۡدَ وَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَہُمۡ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنۡہُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَ رُہۡبَانًا وَّ اَنَّہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾﴾

’’تم اہلِ ایمان کی عداوت میں شدید ترین یہود اور مشرکین کو پاؤ گے‘ اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب ترین اُن لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔‘‘

یہ وہ دَور تھا کہ جب عیسائیوں اور یہود کے درمیان دشمنی چل رہی تھی‘ اُس وقت عیسائی مسلمانوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نجاشیؒ ایمان لے آئے‘ اور شہنشاہِ روم ہرقل (Heraclius) خود بھی اس طرح اسلام لانا چاہتا تھا جس طرح اڑھائی تین سو برس پہلے رومی شہنشاہ قسطنطین عیسائی ہوا تو اس کے ساتھ پوری مملکت عیسائی ہوگئی۔ ہرقل چاہتا تھا کہ مَیں اسلام لے آؤں اور میرے ساتھ میری مملکت بھی اسلام لے آئے‘ تاکہ میری بادشاہت قائم رہے۔ چنانچہ اس کی بادشاہت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی اور وہ اس سعادت سے محروم رہا۔ میرے نزدیک قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیت اُس دَور کی نشاندہی کرتی ہے۔

دوسری آیت وہ ہے جس کی مَیں نے آغاز میں تلاوت کی تھی:

﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَہُوۡدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ۘ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّہٗ مِنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۱﴾﴾

’’اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ‘ یہ آپس ہی میں

ایک دوسرے کے دوست (اور ایک دوسرے کے پشت پناہ اور مددگار) ہیں۔
اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔
یقیناً اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔"

یہ دراصل پیشین گوئی تھی آج کے حالات کے بارے میں‘ ورنہ جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت تو یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان شدید دشمنی تھی۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۳ ملاحظہ کیجیے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ...﴾

"اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے......"

ان کے درمیان ہمیشہ جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ "اصحاب الأُخدود" عیسائی تھے‘ ایک یہودی بادشاہ نے خندقیں کھود کر اُن میں آگ جلا کر انہیں زندہ جلا ڈالا۔ ان کے مابین شدید دشمنی اور عداوت تھی‘ لیکن اب برعکس صورتِ حال ہے کہ ان کے مابین شدید دوستی ہے جس کو آپ کہتے ہیں: "hand in glove" کہ جیسے ہاتھ کے اوپر دستانہ پہن لیں تو پورا ہاتھ اور دستانہ یکجان ہو جاتے ہیں‘ اسی طرح آج یہودیت اور عیسائیت یکجان ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اصل حقیقت یہ ہے کہ عیسائیت یہودیت کے مقاصد پورا کرنے میں اس کا آلۂ کار بن چکی ہے۔ اس صورت حال میں ہمارے لیے راہنمائی سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۱ میں ہے‘ جس کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا۔ اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہے:

﴿فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ﴾ (آیت ۵۲)

"تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی (یہود و نصاریٰ) میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں‘ کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر لگتا ہے کہ ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔"

یہ آیت عالمِ اسلام کے موجودہ حکمرانوں پر کس درجے صادق آ رہی ہے! اس وقت عالَمِ

اسلام کے اکثر حکمران (جن کے لیے بادشاہ کا لفظ موزوں تر ہے) بش کے پرستار ہیں۔ صدر پرویز مشرف صاحب نے بھی اب بش کے سامنے تیسرا سجدہ کیا ہے۔ انہوں نے پہلا سجدہ کیا تھا جب طالبان کے بارے میں یوٹرن لیا تھا۔ ایک حکومت کو خود سپانسر کیا‘ اس کی پشت پناہی کی اور اُن کا سفیر ملا ضعیف ابھی اسلام آباد میں موجود تھا‘ لیکن ان کے خلاف امریکہ کی پوری مدد کی اور انہیں تہس نہس کرنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ صدر مشرف کا دوسرا سجدہ کشمیر کے مسئلے پر یوٹرن تھا۔ ہمارا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ پہلے مسئلہ کشمیر پر بات ہوگی‘ پھر کوئی اور بات ہوگی۔ چنانچہ واجپائی کے دَور میں صدر مشرف صاحب گردن اکڑا اکڑا آگرہ سے واپس چلے آئے تھے کہ پہلے کشمیر کی بات ہوگی‘ پہلے یہ مسئلہ حل کرو‘ اس کے بعد پھر کوئی بات ہوگی۔ اب اس ایشو پر بھی ہم نے سجدۂ سہو کر لیا اور لچک پر لچک دکھائے چلے جا رہے ہیں۔ بھارت کی طرف سے ایک لچک بھی نہیں آئی۔ وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی‘ اور کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔

اب ہمارے صدر صاحب نے تیسرا سجدہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارے میں کیا ہے۔ اسرائیل کے بارے میں ہمارا ہمیشہ سے یہ موقف تھا کہ ہم ہرگز اسے تسلیم نہیں کریں گے‘ چاہے عرب تسلیم بھی کر لیں۔ بانیٔ پاکستان نے اسرائیل کو مغربی دنیا کی ناجائز (illegitimate) اولاد قرار دیا تھا۔ اگر عرب مجبوراً ایک ناجائز ملک کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں تو ضروری نہیں کہ ہم بھی مجبوری کے تحت اسے قبول کریں۔ لیکن اب یہ صورتِ حال زیادہ دُور معلوم نہیں ہو رہی کہ یہ تیسرا سجدہ مکمل ہو جائے گا اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہمارے اپنے ملک کے اندر کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو حکومتی اقدامات کو چیلنج کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی قابلِ ذکر جماعتیں تھیں تو وہ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام تھیں۔ ان دونوں کے پاؤں میں ڈیڑھ صوبائی حکومتیں دے کر بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں اور انہیں ان کے اندر مگن کر دیا گیا ہے۔ اب وہ صدر پرویز مشرف کے خلاف کوئی سٹینڈ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ بہرحال اِس

وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہم نے قرآنی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے بش کو تیسری مرتبہ سجدہ کرلیا ہے اور عیسائیوں کے بعد اب ہم یہودیوں سے بھی دوستی کے لیے بے تاب نظر آ رہے ہیں۔ قائد اعظم نے جو اِس ملک کے بانی و مؤسس ہیں‘ دوٹوک انداز میں اسرائیل کو مغربی قوتوں کا حرامی بچہ قرار دیا تھا اور فرمایا تھا کہ اسے ہم کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اسی طرح ہمارے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان جب امریکہ گئے تھے تو انہیں وہاں یہودیوں کی طرف سے بہت بڑا reception دیا گیا‘ جس میں اسرائیل کو تسلیم کر لینے کی صورت میں طرح طرح کے لالچ دیے گئے۔ لیکن ان کے جواب میں خان لیاقت علی خان مرحوم نے کہا تھا (اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرے!)

"Gentlemen, our souls are not for sale."

’’حضرات! ہماری روحیں بکاؤ مال نہیں ہیں۔‘‘

آپ یہ قیمت دے کر‘ لالچ دے کر ہمیں ایک غلط کام پر آمادہ نہیں کر سکتے‘ ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس واقعے کو ۵۵ برس ہو چکے ہیں اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ہماری حکومت اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ باقاعدہ ریاستی تعلقات کے قیام کی راہ پر گامزن ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ یہود و نصاریٰ کی دوستی ہمارے لیے کبھی نفع بخش نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں قرآنی ہدایت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے:

’’اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا رفیق کبھی نہ بناؤ۔ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور جو کوئی ان سے رشتۂ ولایت استوار کرے گا وہ انہی میں سے ہو گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔‘‘ (المائدۃ:۵۱)

یہ تھی وہ ساری صورتِ حال جس کا ایک جائزہ مَیں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کہ آخری صلیبی جنگ کے معاملات کس طرح قدم بقدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان مایوس کن حالات میں ہمیں امریکہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی بجائے اپنے مالکِ حقیقی سے نصرت و اعانت کا طلب گار ہونا چاہیے۔

اقول قولی ھذا واستغفراللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

رفیق تنظیمِ اسلامی اور قرآنِ حکیم

ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی

محترم جناب ڈاکٹر طاہر خاکوانی نے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ نومبر ۲۰۲۱ء بمقام بہاول پور میں رفقائے تنظیم اور احباب کے لیے نہایت بصیرت افروز اور ولولہ انگیز موضوع پر خطاب فرمایا۔ رفقاء واحباب کی دلچسپی اور افادۂ عام کے لیے اس خطاب کو ترتیب وتسوید کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

تنظیم اسلامی کی دعوت کی جڑ اور بنیاد قرآنِ حکیم ہے۔ قرآن حکیم کی اہمیت اور فضیلت کے پیشِ نظر اس سے ہمارا تعلق کیا ہونا چاہیے‘ کن چیزوں کو ہمیں اختیار کرنا ضروری ہے اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کی ہمیں بیخ کنی کرنی ہے‘ ان باتوں پر تنظیم کے ہر رفیق کو غور وفکر کرنا چاہیے تاکہ ہمارے عمل کو تقویت حاصل ہو۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹﴾ (بنی اسرائیل)

’’بے شک یہ قرآن اُس راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔ اور یہ ان اہلِ ایمان کو جو اچھے عمل کرتے ہیں خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔‘‘

قرآن حکیم ہدایت کی کتاب ہے۔ ویسے تو ہدایت کے پہلو دوسری آسمانی کتابوں میں بھی تھے‘ لیکن قرآن حکیم صرف ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ ’’الھدیٰ‘‘ یعنی ہدایتِ کاملہ ہے اور اس میں رُشد وہدایت کے تمام پہلو توازن واعتدال کے ساتھ سموئے گئے ہیں۔ اس حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ﴾ (المآئدۃ:۸)

’’کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ اُبھارے کہ تم عدل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔

عدل کو لازم پکڑو‘ کیونکہ یہی عمل تقویٰ سے قریب تر ہے۔‘‘

مزید فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ﴾ (النّسآء:۱۳۵)

’’اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم ہو جاؤ اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے‘ چاہے یہ (انصاف کی بات اور گواہی) تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے ماں باپ کے یا رشتہ داروں کے۔‘‘

اس حکم میں ہدایت اور رُشد کے تمام پہلو انتہائی اعتدال اور توازن کے ساتھ موجود ہیں۔ رسولِ مکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((وَ مَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ أَضَلَّهُ اللّٰهُ)) (سنن الترمذی)

’’جو انسان قرآن کے علاوہ کہیں سے بھی ہدایت چاہے گا تو اللہ اسے گمراہ کر دے گا (کیونکہ ہدایت کا منبع وسرچشمہ قرآن حکیم ہے)۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین کی پشت پر سب سے بڑی نعمت یہی قرآنِ حکیم ہے۔ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کی آخری آیت میں ربِّ کائنات نے فرمایا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدہ:۳)

’’آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا‘ اور تم پر اپنی نعمت (جو تیئیس برس سے تمہارے اُوپر اُتر رہی تھی) کو بھی پورا کر دیا‘ اور اسلام کو بطور دین تمہارے لیے پسند کر لیا۔‘‘

رسول مکرم ﷺ فرماتے ہیں:

’’جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی نعمت عطا فرمائی اور اس شخص نے گلہ کیا کہ اللہ نے فلاں شخص پر بڑا فضل فرمایا ہے‘ تو اس نے قرآن جیسی نعمت عظمیٰ کی ناقدری کی۔‘‘

گویا اتنی بڑی نعمت تمہیں ملی ہے کہ اس سے بڑی نعمت کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اسی لیے قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠﴾ (آلِ عمران:۱۰۳)

’’اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو اور باہم متفرق نہ ہو جاؤ!‘‘

یہ ’’حبل اللہ‘‘ قرآن مجید ہے۔ رسول مکرم ﷺ کا قولِ مبارک ہے:

((هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِيْنُ، وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ، وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ))
(سنن الترمذی)

’’یہ اللہ کی مضبوط رسّی ہے‘ اس میں حکمت پر مبنی نصیحتیں ہیں اور یہ صراطِ مستقیم ہے۔‘‘

آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا:

((وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ، وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ)) (سنن الترمذی)

’’یہ تمہارے معاملات کے مابین فیصلہ کن کلام ہے۔ اور یہ دوٹوک کلام ہے‘ کوئی ہنسی مذاق (بے کار یا کوئی از کار رفتہ شے) نہیں ہے۔‘‘ (معاذ اللہ!)

قرآن مجید کی اہمیت اور فضیلت مسلّم ہے اور اسی پر ہماری دنیا و آخرت کا دار و مدار ہے۔ قیامت کے دن جب انسانوں کی آنکھیں کھلیں گی تو وہ دیکھیں گے کہ ان کے ایک جانب جنّت ہے تو دوسری جانب دوزخ! اور جب اہلِ دوزخ کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو یہ قول ان کی زبانوں پر ہوگا:

﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱﴾ (المُلک)

’’اگر ہم نے (اس کو) سنا اور سمجھا ہوتا تو آج ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے۔ پس وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔ پس پھٹکار ہے دوزخ والوں کے لیے۔‘‘

یعنی وہ اعتراف کریں گے کہ ہم نے اس قرآن کی طرف توجّہ نہیں کی‘ نہ اس کو غور سے سنا‘ نہ سمجھا اور نہ ہی اس پر عمل کیا۔ اسی لیے آج ہم دوزخ کی جانب گامزن ہیں۔

رسول کریم ﷺ نے تو اس قرآن کو قوموں کے عروج و زوال کا شاخسانہ بتایا ہے‘ فرماتے ہیں:

((اِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (صحیح مسلم)

’’اللہ تعالیٰ اس کتاب کی بدولت بعض قوموں کو عروج عطا فرمائے گا اور اس کتاب (کو پس پشت ڈالنے اور نظرانداز کرنے) کی بنیاد پر بعض کو ذلیل کر دے گا۔‘‘

اگر قوموں کو ان کے عروج اور سربلندی کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ عروج اور اقتدار تو فرعون‘ نمرود‘ ہامان اور قارون کو بھی حاصل ہوا تھا۔ مگر رسول اللہ ﷺ کا یہ جو ارشاد ہے کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ قوموں کو عروج عطا فرمائے گا‘ اس عروج و سربلندی سے

مراد یہ ہے کہ وہ عروج ایسا ہوگا کہ جس سے تمام نوعِ انسانی کی فلاح و نجات وابستہ ہوگی!

بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنی تالیف ’’رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب‘‘ میں رقم طراز ہیں کہ:

’’ایم این رائے (M.N.Roy) ایک بنگالی ہندو تھا اور وہ انٹرنیشنل کمیونسٹ آرگنائزیشن کا رکن تھا۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں بریڈلا ہال لاہور میں ’اسلام کا تاریخی کردار‘ (The Historical Role of Islam) کے عنوان سے لیکچر دیا اور کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب محمد (ﷺ) نے برپا کیا۔ واضح رہے کہ وہ عقیدت مند نہیں ہے‘ ایک بنگالی ہندو اور ٹاپ کا کمیونسٹ ہے‘ لیکن وہ یہ بات تسلیم کر رہا ہے۔‘‘

دنیا میں بڑی فتوحات اٹیلہ اور سکندرِ اعظم نے بھی کیں‘ لیکن وہ صرف قوت و طاقت کی بنیاد پر عسکری مہمات (brute military campaigns) تھیں۔ اس کے نتیجے میں دنیا کو کوئی علم‘ کوئی نئی روشنی‘ کوئی تہذیب اور تمدن پیش نہیں کیا گیا۔ وہ صرف قوت و طاقت کے بل پر فتح و کامیابی تھی۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کا جو انقلاب تھا‘ وہ عظیم ترین اور کامل ترین انقلاب تھا‘ کیونکہ اس میں جو عروج حاصل ہوا اس میں نیا علم‘ نئی تہذیب‘ نئی روشنی‘ نیا تمدن اور اخلاقِ فاضلہ یہ ساری چیزیں ساتھ آئی ہیں۔ اور ان سب کی جڑ اور بنیاد قرآنِ حکیم ہی تھا جس کے ذریعے وہ عظیم الشان انقلاب برپا ہوا۔

رسول مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَيْکَ)) (صحیح مسلم)

’’قرآن حکیم تمہارے حق میں دلیل ہوگا یا تمہارے خلاف استغاثہ لے کر کھڑا ہوگا۔‘‘

یعنی جو لوگ اس کو پڑھیں گے‘ اس پر ایمان لائیں گے‘ اسے سمجھیں گے‘ اس پر غور و فکر کریں گے‘ اس کے احکام کے مطابق عمل کریں گے‘ اس کو آگے پہنچائیں گے تو ایسے لوگوں کے حق میں قرآن حکیم سفارش کرے گا۔ اور جو اس کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھیں گے‘ پس پشت ڈال دیں گے اور اپنا زیادہ وقت فضول مشاغل میں گزار دیں گے اور قرآنِ حکیم پڑھنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوگا تو قرآنِ حکیم ان کے خلاف استغاثہ لے کر کھڑا ہو جائے گا۔

ہم بحیثیتِ اُمّتِ مُسلمہ خُوب جانتے ہیں کہ آخرت میں ہماری نجات ہمارے ایمانِ قلبی اور اعمالِ صالحہ پر منحصر ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور اس کے لیے وہ محنت کرے جیسا کہ محنت کرنے کا حق ہے اور وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے لوگوں کی محنت کو اللہ تعالیٰ شرفِ قبولیت سے نوازے گا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں نجات کے لیے محنت‘ کوشش اور ایمان ناگزیر ہے اور ایمان کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ایمان حاصل کہاں سے ہوگا؟ تو ہم سب جانتے ہیں کہ جو شعوری ایمان ہے اس کا منبع ومحور قرآنِ حکیم ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ (الانفال:۲)

’’اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔‘‘

اس کی ترجمانی مولانا ظفر علی خان نے یوں کی ہے:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

چنانچہ ایمان قرآنِ حکیم سے ہی ملے گا‘ مگر اس کے حصول کے لیے سچی طلب درکار ہے۔ یقین کامل اور طلب میں صداقت ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں سیرت کی کتابوں میں درج ہیں۔ مثلاً حضرت سلمان فارسی ؓ کی دربارِ رسالت ﷺ میں پہنچنے کی داستان ہمارے سامنے ہے۔ آپؓ کا تعلق ایران سے تھا جہاں کے لوگ آتش پرست تھے۔ آپ اس مشرکانہ ماحول کو چھوڑ کر حق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ دل کی پیاس ہر قسم کی کثافت سے پاک تھی‘ نیت اور طلب میں سچائی کا غلبہ تھا‘ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نظرِ کرم فرمائی اور انہیں حضور ﷺ کے قدموں تک پہنچا دیا اور وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ جب کہ دوسری طرف آپ ﷺ کا سگا چچا جو آپ ﷺ کا پڑوسی بھی تھا‘ وہ قرآن سنتا بھی تھا‘ لیکن اس کے دل میں حق وصداقت کی کوئی حرارت ہی نہیں تھی‘ چنانچہ وہ ایمان کی دولت سے تہی دامن رہ گیا۔ قرآنِ حکیم نے ابولہب کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا ہے:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝۲﴾ (اللّھب)

’’ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ نامراد ہوا۔ اس کا مال جو اس نے کمایا وہ اس

کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔‘‘

قرآن حکیم منبعِ ایمان ہے اور اپنی اہمیت وفضیلت کے اعتبار سے یہ ایک کتابِ انقلاب ہے۔ الطاف حسین حالی قرآن کی مدح میں فرماتے ہیں: ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

قرآن کے حوالے سے مشرکین کا مشاہدہ یہ تھا کہ جو بھی قرآن سن کر اس پر ایمان لے آتا ہے اس کے اندر غیرت وحمیت اور قوتِ ایمانی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ خواہ اسے جان سے مار دو لیکن وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ حضرت یاسر اور حضرت سُمیہ ؓ کو بڑی بے رحمی سے مارا پیٹا جاتا تھا اور بالآخر ان دونوں کو انتہائی بہیمانہ انداز سے شہید کر دیا گیا‘ مگر شمعِ رسالت کے ان پروانوں کی زبان سے کبھی کلمۂ کفر نہ نکلا۔ حضرت بلال ؓ پر تشدد کی انتہا کر دی گئی مگر اس مردِ مجاہد کی زبان سے سوائے اَحد اَحد کے اور کچھ نہیں نکلا۔ مشرکین ان حقائق کا بغور جائزہ لے رہے تھے‘ لہٰذا ’’کھسیانی بلی کھمبا نوچے‘‘ کے مصداق انہوں نے باہم مشورہ کیا‘ جسے قرآنِ حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶﴾ (حٰمٓ السَّجدۃ)

’’اور ان کافروں نے کہا کہ تم اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شوروغوغا مچاؤ‘ شاید اس طرح تم غالب آجاؤ۔‘‘

وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح نہ کوئی قرآن صحیح طرح سنے گا اور نہ اس کی طرف مائل ہوگا‘ لہٰذا ایسا ماحول پیدا کرو کہ کوئی قرآنِ حکیم کو سن ہی نہ سکے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ وہ ایمان تو چودہ سو سال پہلے قرآنِ حکیم کی بنیاد پر لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا تھا تو یہ بالکل احمقانہ بات ہوگی۔ موجودہ دور میں بہت سی شخصیات صرف ایک بار قرآن مجید کا کچھ حصہ سن کر یا پڑھ کر ایمان لے آئیں۔ مثلاً کیٹ سٹیونز جو ایک مشہور سنگر تھا اور برطانیہ میں گٹار بجا کر گانے گاتا تھا‘ اس کے بہت سے دلدادہ (fans) تھے۔ لیکن ایک دن اتفاقاً قرآن

مجید اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ جب مَیں نے قرآن کا پہلا chapter کھولا تو سورۃ البقرہ میرے سامنے تھی' اس میں لکھا تھا: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ (البقرۃ:۲) ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔'' کہنے لگا: ''ہمیں تو مغربی تعلیم یہ سکھاتی ہے کہ ہر چیز میں شک پیدا کرو (doubt everything)۔ اوپر سے' نیچے سے' دائیں سے' بائیں سے دیکھو' اس کے اندر کوئی نہ کوئی نقص پیدا کرو۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو پہلے صفحہ سے ہی کہہ رہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے' یعنی اتنا بڑا دعویٰ ہے!'' اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اس نے قرآنِ حکیم پڑھا تو اس کی کائنات ہی بدل گئی اور وہ کیٹ سٹیونز سے یوسف اسلام ہو گیا۔ اسی طرح علامہ اسد جو ایک یہودی تھے' وہ بھی قرآن کے ذریعے سے ہی ایمان لے آئے۔ ایسی ہی مثال موریس بوکائے کی ہے جنہوں نے ایک کتاب "The Bible, The Quran and Science" کے نام سے لکھی' وہ بھی قرآنِ مجید کا مطالعہ کر کے ایمان لائے تھے۔ چنانچہ آج کے دور میں بھی ایسی شخصیات اس دنیا میں موجود ہیں جن کے بارے میں ہم برملا کہہ سکتے ہیں:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

حقیقت یہ ہے کہ جب قرآنِ حکیم کسی کے باطن میں اُترتا ہے تو اس کے اندر کی دنیا کو بدل دیتا ہے اور جب اندر کی دنیا بدلتی ہے تو باہر کی دنیا بھی بدل جاتی ہے' یہ اعجازِ قرآن ہے۔ یہ قرآنِ حکیم ہی تھا جس کی بدولت نبی مکرم ﷺ نے معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے شرک' بے دینی' الحاد اور مادہ پرستی کی جڑیں کاٹ دیں۔ دنیا کی محبت اور مال کی محبت جیسی گمراہیوں میں ڈوبی نوعِ انسانی کو یہاں سے نکال کر ایمان ویقین سے بہرہ مند فرمایا۔ قرآنِ حکیم خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ (الحدید:۹)

''وہی (اللہ) ہے جو اُتارتا ہے اپنے بندے پر یہ روشن آیات تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔''

رسول کریم ﷺ نے نوعِ انسانی کو ایمان ویقین کی روشنی سے منور و تاباں کیا' لوگوں کے قلوب واذہان کو بدلا' جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے چار مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۱۶۴﴾

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اُس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے' انہیں پاک صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے' جبکہ یہ لوگ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

یعنی ان کے جو بھی مشرکانہ عقائد' ملحدانہ خیالات اور باطل نظریات تھے آپ ﷺ نے اس قرآنِ حکیم کے ذریعے سے ان کا تزکیہ فرمایا' انہیں کتاب اور اس کے اندر موجود احکامات کی تعلیم دی اور ان کی حکمتیں بھی بیان فرمائیں۔ نبی مکرم ﷺ نے قرآن مجید کی بدولت انسانوں کے قلوب واذہان کو بدلا اور ایک جماعت قائم کی' انہیں منظم کیا' ان کی تربیت کی اور ان کو صبر کے مراحل سے گزارا' یہاں تک کہ ایک عظیم الشان انقلاب برپا ہو گیا:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۸۱﴾ (الاسراء)

''آپ کہہ دیجیے: حق آن پہنچا اور باطل مٹ گیا' اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے۔''

قرآن مجید کی دعوت میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اختیار کرو۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۲۱﴾ (البقرۃ)

''اے بنی نوعِ انسان! اپنے رب کی بندگی اختیار کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم (آخرت کے دکھوں سے) بچ سکو۔''

اللہ کی یہ بندگی اس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اور کامل اطاعت کی کیفیت میں ہونی چاہیے۔ یہ قرآنِ حکیم کی اوّلین (foremost) دعوت ہے۔

اس کے بعد دو چیزیں اور ہیں: دعوت و اقامت' یعنی ''دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین''۔ ان دونوں چیزوں کی بھی قرآنِ حکیم ہمیں پُرزور دعوت دیتا ہے۔ ازروئے قرآنِ حکیم:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ

الْمُسْلِمِيْنَ﴿۳۳﴾﴾ (حٰمٓ السَّجْدَة)

''اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ مَیں فرماں برداروں میں شامل ہوں۔''

اللہ ربّ العزت رسول کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (المآئدۃ:۶۷)

''اے رسول (ﷺ)! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کیجیے۔ اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو (اس کا مطلب یہ ہوگا کہ) آپ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا۔''

مطلب یہ کہ قرآنِ حکیم کے ذریعے سے آپ دعوت دیں، تبلیغ کریں اور اس پیغام کو پہنچائیں، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ اُمّتِ مُسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کے پیغام کو آگے پہنچائیں اور اسی پیغام میں اقامتِ دین بھی شامل ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ (الشُّوْرٰی:۱۳)

''تم دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔''

اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ عادلانہ اور منصفانہ نظام اجتماعی سطح پر قائم کرنا۔

اس حوالے سے یہ پہلو ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہے کہ حقیقی کامیابی اُخروی کامیابی ہے۔ دنیا میں جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لو گے، جو مال بھی خرچ کرو گے، جان اور وقت لگاؤ گے، اپنی صلاحیتوں کو کھپاؤ گے تو اس کے نتیجے میں جو کامیابی حاصل ہوگی وہ کامیابی عارضی ہے جبکہ اصل کامیابی اُخروی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴿۱۸۵﴾﴾

''پس جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ (صحیح معنوں میں) کامیاب ہوگیا۔ اور یہ دنیوی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

صحابہ کرام ؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے قرآنِ

حکیم کو سنا اور ان کی کایا پلٹ گئی۔ ان کے اندر یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ اس لیے کہ انہوں نے قرآنِ حکیم کو سینے سے لگایا اور جب قرآنِ حکیم سینے سے لگا تو بس دنیا ہی بدل گئی۔ بقول اقبال:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

صحابہ کرام ؓ کی سوچ، ان کی فکر، ان کا نقطہ نظر، ان کی اقدار، ان کے عزائم، اُمنگیں، دلچسپیاں، اُن کے اخلاق، سیرت و کردار، ان کے خوف، اُمیدیں، خلوت و جلوت، اُن کی انفرادیت و اجتماعیت، رات و دن، حتیٰ کہ ان کی کائنات ہی بدل گئی اور ان کی زندگی میں کچھ بھی ایسا باقی نہیں رہا جس کو وہ ماضی میں گزار کر آئے تھے۔ اور یہ تبدیلی کوئی معروضی تبدیلی نہیں تھی بلکہ حقیقی تھی۔ ایسی ہی تبدیلی سے انقلاب اور کشمکش کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ بقول اقبال: ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

تبدیلی جب واقعی و حقیقی ہو تو اس میں سے لازماً کشمکش اور کشاکش جنم لیتی ہے اور یہ کشاکش سب سے پہلے اپنے نفس کے ساتھ ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنے نفس کو اس کی خواہشات کو اللہ کی رضا اور اس کی پسند کے تابع کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ابلیس کے ساتھ کشمکش، باطل معاشرے، باطل نظریات اور انجام کار باطل نظام کے ساتھ کشمکش اور پنجہ آزمائی ضروری ہے۔ سیرتِ رسول ﷺ کا مطالعہ کریں، صحابہ کرام ؓ کی سیرتوں کو پڑھیں تو واضح طور پر یہ نظر آئے گا کہ ان کی زندگیوں میں یہی کچھ تو ہے کہ انہوں نے قرآنِ حکیم سیکھا، نبی اکرم ﷺ سے تعلق مضبوط کیا، تو زندگی میں تبدیلی آئی، کشاکش نے جنم لیا اور وہ ع ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے!'' کے مصداق بن گئے۔ بالآخر اللہ عزّوجل نے ان کو سرخرو کیا اور اس طرح ان کی سیرت ہمارے لیے ایک محرک بن کر سامنے آگئی۔ اصل میں قرآنِ حکیم سے ہمارا تعلق ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ہمیں possess کر لے، یعنی قرآن ہم پر اور ہماری فکر و نظر پر پوری طرح قابض ہو جائے اور یہی قبضہ سب سے مبارک قبضہ ہے۔

کیٹ سٹیونز (یوسف اسلام) بھی یہی کہتا تھا کہ جب مَیں نے قرآنِ حکیم پڑھنا شروع کیا تو قرآن نے مجھ پر قبضہ کرلیا (Quran possessed me)۔ پھر مَیں ہر وقت ڈرتا تھا کہ کہیں قرآن مجھ سے چھن نہ جائے۔ رات کو سوتا تو قرآن تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا۔ رات کو پڑھتا اور صبح اٹھتے ہی پھر اس کی تلاوت کرتا۔ گویا ایک لگن اس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ اندر ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی کہ ہر وقت ہی اسے پڑھتا رہتا۔ ضروری ہے کہ ہمارے اندر بھی یہ کیفیت پیدا ہوجائے کہ قرآن کا ہم پر قبضہ ہوجائے اور قرآن ہمارا اوڑھنا بچھونا بن جائے۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قرآنِ حکیم کو پڑھو اور صرف ایسی رواروی میں نہ پڑھو کہ بس ثواب حاصل کرنے کی نیت ہو۔ اللہ کے سامنے عاجزی کرو' گڑگڑاؤ' اسے سمجھو' اس پر غور وفکر کرو' خود اس پر عمل کرو اور اسے آگے پہنچاؤ۔ کسی کو خبردار کرنا ہو یا خوشخبری سنانی ہو اس کا ذریعہ بھی قرآن ہی ہو۔ کسی کو تعلیم دینی ہو' تذکیر کرنی ہو' تربیت کرنی ہو' کسی کو تبلیغ کرنی مقصود ہو تو اس کا ذریعہ بھی قرآن ہی ہونا چاہیے۔

مزید یہ کہ قرآن مجید کی گہرائی میں اُتر کر حکمت و دانائی کے موتی چن کر لانا ہمارا مقصد ہونا چاہیے' کیونکہ اسی سے ایمان ویقین کی کیفیت پیدا ہوگی۔ بقول اقبال ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

علّامہ اقبال کے زیر مطالعہ قرآن کا نسخہ جو میوزیم میں رکھا ہوا ہے اُس کے اوراق اُن کے رونے کی وجہ سے نچڑ گئے ہیں۔ ہماری بھی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔ اپنا تزکیۂ نفس کرنا ہو' تصفیۂ قلب ہو' روح کو جلا بخشنی ہو' اور باطل نظام کو جڑوں سے اکھیڑ کر اس کی جگہ ایک عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم کرنا مقصود ہو تو یہ بغیر قرآن کے نہیں ہوسکتا! رسول کریم ﷺ نے ایک طویل حدیث کے آخر میں فرمایا:

((مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ أُجِرَ، وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ، وَمَنْ دَعَا إِلَيْهِ هُدِىَ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ)) (سنن الترمذی)

''جس نے اس (قرآنِ حکیم) کے حوالے سے بات کی اُس نے سچ کہا' جس نے اس پر عمل کیا وہ اجر پا گیا' جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اُس نے عدل کیا۔ اور جس نے

لوگوں کو قرآن کی طرف بلایا اس کو اللہ کے راستے کی طرف ہدایت نصیب ہوگئی۔''

لہٰذا قرآنِ حکیم سے ہمارا اصل تعلق اس طرح ہونا چاہیے۔ محض رسمی طور پر یا کسی کاغذی کارروائی کے طور پر قرآنِ حکیم کا پڑھنا' قرآن کے ساتھ زیادتی اور اس کی حق تلفی ہے۔

ایک اور اہم چیز پیش نظر رہے کہ ہماری فکر انقلابی ہے اور اس میں پختگی قرآنِ حکیم سے حاصل ہوگی۔ قرآنِ حکیم کا دامن تو انتہائی وسیع ہے۔ اس میں تبشیر بھی ہے' ''انذار'' (warning) بھی ہے' آخرت کے حوالے سے بھی بہت کچھ ہے۔ یہ علوم ومعرفت کا خزانہ ہے' مگر ہماری انقلابی فکر کا محور ''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' ہے۔ اس سے نظر نہیں ہٹنی چاہیے۔

اللہ کے رسول ﷺ پر مشکل حالات آتے رہے۔ تنظیم اسلامی کا ہر رفیق جب اپنے آپ کو قرآن وسُنّت اور شریعت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے گا اس پر بھی لازماً مشکلات آئیں گی۔ مثلاً اگر گھر میں پردے کا معاملہ ہو تو یقیناً رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ آپ رسم و رواج کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کریں گے تو معاشرہ دیوار بن کر کھڑا ہوجائے گا' تصادم ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام ؓ ان مشکل مراحل سے گزرے ہیں۔ ہماری مشکلات تو ان پر گزرے مصائب کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ہیں۔ ان مشکلات میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مختلف پیرائے میں تسلی دیتا' مثلاً:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ (العنکبوت:۴۵)

''(اے نبی ﷺ!) جو کتاب آپ کی طرف وحی کے ذریعے بھیجی گئی ہے اس کی تلاوت کیجیے!''

ظاہر بات ہے کہ وہاں تلاوت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جیسے ہم عربی نہیں جانتے اور محض ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ تلاوت کا مطلب ہے پیچھے پیچھے آنا' follow کرنا۔ نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے ہمارے لیے بھی یہی ہدایت ہے کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں اور مسلسل پڑھتے رہیں۔ اس کے اوامر ونواہی سے آگاہی حاصل کریں اور اپنا عمل درست کریں۔ مسلسل قرآنِ حکیم پڑھتے رہنے سے ہمارے اندر کی نفسانی خواہشات' مال ودولت کی محبت اور اس کی کثافت بھی دُور ہوجائے گی۔ بقول اقبال:

یہ مال و دولت دُنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں' لا الٰہ الّا اللہ!

اب اس کو محدود (confined) کیسے کیا جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ عبادات کے ذریعے سے اپنے نفس پر قابو پایا جائے۔ اور عبادات میں سب سے اوّلین (foremost) پنج وقتہ نماز ہے اور پھر خصوصاً رات کی نماز۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ؕ﴾ (العنکبوت:۴۵)

’’(اے نبی ﷺ!) جو کتاب آپ کی طرف وحی کے ذریعے بھیجی گئی ہے اس کی تلاوت کیجیے اور نماز قائم کیجیے۔ بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔‘‘

نماز کے اندر یہ قوت اور طاقت ہے کہ وہ بندۂ مسلم کو بُرائیوں سے باز رکھتی ہے۔ پھر مال و اولاد کی محبّت کو بھی کم سے کم کرنا ہے۔ آپ ﷺ کو بھی بار بار تلقین کی گئی ہے کہ قرآن کی طرف توجّہ فرمائیں تاکہ اس کے ساتھ آپ کا ذہنی اور قلبی تعلق جڑا رہے۔ اگر قرآن سے ہمارا یہ تعلق کمزور پڑ گیا تو جذبات سرد پڑ جائیں گے اور ہم اپنی ذمہ داریوں سے راہِ فرار اختیار کریں گے۔ اس صورت میں دنیاداری انسان کے پیر جکڑتی ہے، کسی اجتماعی مہم کے موقع پر کئی عذر پیش کرتا ہے اور اس کی ترجیحات ہی بدل جاتی ہیں۔

دوسری چیز اپنے اندر نظم وضبط پیدا کرنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ﴾ (التغابن:۱۶)

’’پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک، اور سنو اور اطاعت کرو، اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔‘‘

سنو اور اطاعت کرو (Listen and obey!) بس یہی نظم ہے۔ یعنی تمہارا امیر جو تم سے کہہ رہا ہے اس کی بات پر توجّہ دو اور اس کے مطابق ہی عمل کرو۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ : بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (سنن الترمذی)

’’مَیں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: التزامِ جماعت کا، (امیر کا حکم) سننے اور ماننے کا، ہجرت کا، اور اللہ کے راستے میں جہاد کا!‘‘

اس ضمن اہم چیز سمع وطاعت ہے۔ کیونکہ تعمیری کام منظّم جِدّوجُہد کے بغیر ممکن نہیں۔ تخریبی کام کا

اپنا انداز ہوتا ہے مگر تعمیری (constructive) کام صرف منظم جماعت ہی کر سکتی ہے۔ ایسی کوئی تحریک ترقی نہیں کر سکتی جس میں نظم وضبط کا فقدان ہو۔

ایک اور چیز جو ہم نے اختیار کرنی ہے وہ جہاد ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ؕ﴾ (الحج:۷۸)

’’اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔‘‘

جہاد، محنت، کوشش، ایثار وقربانی، اپنی توانائیاں، اپنی صلاحیتیں کام میں لانا اور اس راہ میں کھپانا، ہمارا بنیادی ہدف ہونا چاہیے۔ پھر شہادت کی آرزو اپنے دل میں رکھنا۔ ہم عاشقانِ رسولؐ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں رسول کریم ﷺ کا یہ فرمان بھی پیش نظر رکھنا چاہیے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلَ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ، ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ)) (صحیح البخاری)

’’قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میری بڑی خواہش ہے کہ مَیں اللہ کی راہ میں جنگ کروں تو اس میں قتل کر دیا جاؤں، پھر مَیں زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں، پھر مَیں زندہ کیا جاؤں، پھر (اللہ کی راہ میں) قتل کیا جاؤں، پھر مَیں زندہ کیا جاؤں، پھر (اللہ کی راہ میں) قتل کیا جاؤں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کے دل میں تو یہ شدید خواہش ہو اور ہمارے اندر اس سے گریز ہو تو یہ کیسا عشقِ رسولؐ ہے؟ ع ’’جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں!‘‘ اور بقول اقبال ؎

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

اپنی جان، اپنی صلاحیت، اپنے اوقات، اپنی قوت اور اپنا مال بچا بچا کے نہ رکھو، بلکہ خرچ کرو۔ ایک داعی کے اندر شوقِ شہادت، جذبۂ جہاد اور ایثار وقربانی کا داعیہ ہونا ناگزیر ہے۔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

اجتماعیت کے ہر موقع پر دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا ہر رفیق کے لیے لازمی ہے۔ اس موقع پر صبر وتحمل سے کام لینے سے ہی تو ہماری تربیت ہوگی۔ صحابہ کرام ؓ کے بارے میں اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط﴾ (الحشر:۹)

’’اور وہ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں‘ اگرچہ وہ خود اس کے زیادہ حاجت مند ہوں۔‘‘

لہٰذا یہ وصف ہمارے اندر بھی ہونا چاہیے۔ پھر دل کی سچی لگن کہ جس سے انسان ذہنی طور پر مطمئن ہو کہ ہم ایک تنظیم کے ساتھی ہیں۔ محض تنظیم میں نام لکھوا دینا ہی ہمارا مقصد نہ ہو‘ بلکہ جس مشن کے لیے اس میں شامل ہوئے ہیں اس کی سچی تڑپ ہمارے اندر جاگزیں ہونا لازمی ہے۔ جیسا کہ ایک موقع پر بانی تنظیمؒ نے کہا تھا کہ ’’راتوں کی نیند اُڑ جائے یہ سوچ کر کہ یہ معاشرے میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ فکر ہماری راتوں کی نیند اور دن کا سکون ختم کر دے۔‘‘ پھر دوسروں کے عمل کو دیکھے بغیر ہمیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہنا چاہیے۔ ہمارے پائے استقامت میں لغزش نہیں آنی چاہیے۔ دین کا کام مستقل مزاجی اور تسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔ بقول اقبال: ؎

یقیں محکم‘ عمل پیہم‘ محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ایک اور اہم چیز جو اجتماعیت میں لازمی ہونی چاہیے اس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح:۲۹) ’’محمد(ﷺ) اللہ کے رسول ہیں‘ اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بہت سخت اور آپس میں انتہائی رحیم و شفیق ہیں۔‘‘ چنانچہ رفقاء کی آپس کی کیفیت بھی رحم و شفقت پر مبنی ہونی چاہیے‘ کیونکہ نفرت کرنے والے دل آپس میں کبھی نہیں مل سکتے اور منافقانہ میل جول حقیقی اطاعت کی بنیاد بن ہی نہیں سکتا۔ خود غرضی بھی رفاقت میں دیوار بنتی ہے۔ باہمی طور پر اخوت و محبت‘ ہمدردی و خیر خواہی‘ باہمی اعتماد و حسن ظن اور باہم ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے رہنے سے ہی یہ جماعت سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ (الصّف)

’’بے شک اللہ پسند کرتا ہے اپنے ان بندوں کو جو جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر‘ گویا

کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔‘‘

اگر دل آپس میں پھٹے ہوئے ہوں‘ میل جول میں منافقت ہو تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کیسے بنے گی؟

جماعتی زندگی میں کچھ چیزوں کو ہمیں اپنے اندر سے نکال پھینکنا (eradicate کرنا) ہوتا ہے اور کچھ چیزیں اختیار کرنا ہوتی ہیں۔ نکال پھینکنے والی چیزوں میں سب سے پہلی چیز نیت کا کھوٹ ہے۔ یہ نیت اتنی اہم چیز ہے کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اپنی اپنی کتاب کی ابتدا نیت سے متعلق حدیث سے ہی کی ہے۔ چنانچہ ہماری نیت محض اللہ کی رضا‘ اخروی نجات اور اپنے فرض کی ادائیگی کی ہونی لازمی ہے۔ دنیا میں کسی کی خوشنودی مقصود نہ ہو‘ کوئی ذاتی غرض یا دنیاوی مفاد وابستہ نہ ہو۔ جان لیجیے کہ نیت کا کھوٹ انسان کے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے اور جو چیز کردار پر اثر انداز ہو وہ انسان کو کامیابی کی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔

نکال پھینکنے کے لائق دوسری چیز حُبِّ جاہ ہے۔ شہرت اور نام و نمود کی خواہش ہرگز نہ ہو۔ ایک داعی کو ان چیزوں سے کوسوں دُور رہنا چاہیے۔ ریاکاری بھی انسان کے ہر عمل پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ‘ وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ‘ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (مسند احمد)

’’جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اُس نے شرک کیا‘ جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اُس نے شرک کیا‘ جس نے دکھاوے کا صدقہ و خیرات کیا اُس نے شرک کیا۔‘‘

لہٰذا اس چیز کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا ہے۔

اس ضمن میں تیسری چیز خود پسندی ہے۔ یہ بھی انسان کی شخصیت کو ہلکا کر دیتی ہے۔ بقول شاعر ع ’’اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں!‘‘ یعنی یہ کیفیت نہ ہو کہ میرے اندر ہی ساری خوبیاں ہیں‘ میرے اندر کوئی نقص‘ عیب اور کمزوری نہیں۔ اس لیے کہ اس سے پھر بغض و عداوت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کسی دوسرے کی تعریف برداشت نہیں کرتا۔ مَیں بہت اچھا مقرر ہوں‘ بہت اچھا لکھاری ہوں۔ یہ چیزیں ایک داعی کے اندر ہرگز نہیں ہونی چاہئیں‘ بلکہ اس میں عاجزی و انکساری ہونا ضروری ہے کہ میرے اندر جو بھی صلاحیت اور جو بھی خوبی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کے فضل و کرم سے ہے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ دُنیوی معاملات میں خود کو غیر ضروری رعایت دینا اور دوسروں کو کم سے کم گنجائش اور رعایت دینا۔ یہ چیز بھی نکال پھینکنے کے لائق ہے۔ داعی کے لیے معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الحشر)

''اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

''شُحّ'' کہتے ہیں تنگ دلی اور لالچ کو' لہٰذا یہ تنگ دلی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ اگر آپ کو اپنے اندر قائدانہ صلاحیت پیدا کرنی ہے تو دوسروں کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس دیجیے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انسان میں ضعفِ ارادہ نہ ہو کہ شروع میں تو بڑے جوش و جذبے سے تنظیم میں شامل ہو گئے' اور بہت کچھ کر گزرنے کے ارادے باندھ لیے' لیکن جب ذمہ داریوں کا بوجھ کاندھوں پر آیا تو ہمت جواب دے گئی اور جوش و ولولہ سرد پڑنے لگا ہے۔ ضعفِ ارادہ سے اقامتِ دین کی راہ میں مال اور وقت' بلکہ سب کچھ بچانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا اس کی ترجیحات میں شامل ہو جاتی ہے۔

اصل میں ہمارا ہر دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہونا چاہیے۔ دنیا میں تو سب ہی یہ چاہتے ہیں کہ وہ آگے سے آگے بڑھتے جائیں مگر اصل معاملہ تو دین کا ہے۔ ہماری ترجیح تو دین ہونا چاہیے اور اس کے لیے مؤثر ترین اور طاقت ور ترین عامل (agent) اللہ کا کلام ہے جو ہر مرحلے پر انسان کو راہ دکھاتا ہے۔ یہ انسان کی نفسیات سے بھی بات کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی ہر کمزوری سے خوب واقف ہے' اُسی نے تو انسان کو تخلیق کیا ہے' اُس کے فطری رجحان' اُس کی پسند و ناپسند سب کو وہ جانتا ہے۔ انسانی زندگی کے ہر شعبے معیشت' معاشرت' سیاست' عقائد و رسومات اور عبادات ہر پہلو سے وہ اپنے کلام میں ہدایت دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں غوطہ زنی انسان کی ہر تشنگی کو سیراب کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ میرے' آپ کے اور ہم سب کے دلوں میں اس قرآنِ عظیم اور فرقانِ حمید کو اتار دے' اس کے ساتھ ہمارا ایک زندہ تعلق پیدا ہو جائے' اس کے مطابق ہمارا جینا اور مرنا ہو جائے اور اس پر عمل کرنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی کیفیت ہمارے اندر پیدا ہو جائے۔ آمین یا ربّ العالمین! ❁❁❁

التوحید فی القرآن

ازقلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ

دنیا کی مذہبی کتابوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوسکتی ہے کہ قرآن حکیم کے علاوہ کسی الہامی کتاب نے توحید باری تعالیٰ پر اس قدر زور نہیں دیا ہے۔ بقول پادری سی ایف اینڈریوز (Rev. Dr. C. F. Andrews) ''دنیا میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے اپنا کلمہ ہی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مقرر کرلیا ہے''۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قرآن ہی وہ واحد الہامی کتاب ہے جس نے شرک کی تمام ممکن صورتوں کا ابطال کر کے خالص توحید کا اثبات کیا ہے' یعنی قرآن نے شرک فی الذات' شرک فی الصفات' شرک فی الحکم' شرک فی العبادات' شرک فی التصرّف اور شرک فی الآثار......غرض کہ ہر ممکن صورت کا ابطال کر دیا ہے۔ اس موضوع پر قرآن حکیم میں سو سے زائد آیات موجود ہیں۔ میں اس وقت ان میں سے چند آیات پیش کروں گا:

(۱) ﴿وَلَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ۚ وَاِنۡ یُّرِدۡکَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِہٖ ؕ﴾ (یونس)

''اور مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرسکے تیرا نہ بُرا۔ پس اگر تُو نے ایسا کیا' تو تُو بھی فوراً ظالموں میں سے ہو جائے گا۔ اور اگر اللہ تجھے کچھ تکلیف پہنچا دے تو اُس کے سوا کوئی اُس کو دور کرنے والا نہیں ہے۔ اور اگر اللہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو نہیں ہے کوئی اسے ردّ کرنے والا۔''

(۲) ﴿اَنَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا ؕ﴾ (الانعام:۷۱)

''کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں!؟''

(۳) ﴿قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَلَا یَمۡلِکُوۡنَ کَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡکُمۡ وَلَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۵۶﴾﴾ (بنی اسرائیل)

''(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ منکرین سے کہہ دیں کہ تم اُن کو پکار کر دیکھ لو جن کو تم نے اللہ کو چھوڑ کر اپنا معبود بنا رکھا ہے کہ وہ نہ تو تم سے مصیبت کو دُور کر سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔''

(۴) ﴿وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَکُمۡ وَلَاۤ اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ﴿۱۹۷﴾﴾ (الاعراف)

''اور وہ لوگ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو' نہ تو تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔''

(۵) ﴿وَالَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مَا یَمۡلِکُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِیۡرٍ ﴿۱۳﴾ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡا دُعَآءَکُمۡ ۚ وَلَوۡ سَمِعُوۡا مَا اسۡتَجَابُوۡا لَکُمۡ ؕ﴾ (فاطر:۱۴)

''اور جن کو تم پکارتے ہو اُس کے سوا (خواہ وہ رسول ہوں یا نبی اور ولی ہوں یا اولادِ رسول) وہ تو کھجور کی گٹھلی پر جو چھلکا ہوتا ہے' اس کے بھی مالک نہیں ہیں (کہ تمہیں بخش دیں)۔ اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری پکار سن بھی نہ سکیں' اور (بفرضِ محال) اگر سن بھی لیں تو تمہیں جواب نہیں دے سکتے۔''

(۶) ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡہُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾﴾ (الاعراف)

''اللہ کو چھوڑ کر تم لوگ جن کو پکارتے ہو وہ تو تمہاری ہی طرح اللہ کے عاجز بندے ہیں (تو وہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟) اگر تم سچے ہو تو انہیں پکارو' اور انہیں لازم ہے کہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں (اگر نہ دے سکیں تو سمجھ لو کہ وہ تمہاری مدد بھی نہیں کر سکتے)۔''

(۷) ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ ہُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ ﴿۱۵﴾ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ وَیَاۡتِ بِخَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۶﴾ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب (اپنی ہستی کے لیے) اللہ کی طرف محتاج ہو' اور (صرف) اللہ ہی ہر چیز سے بے نیاز اور سب خوبیوں والا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور نئی مخلوق

پیدا کر دے۔ اور یہ بات اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اور کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

(۸) ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ﴾ (الحج:۷۳)

''وہ لوگ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے (پوجتے) ہو وہ (اس قدر عاجز ہیں کہ) اگر سب مجتمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے واپس نہیں لے سکتے۔''

(۹) ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا یَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِیْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِیْرٍ ۝۲۲﴾ (سبا)

''(اے رسول ﷺ!) آپ (ان مشرکوں سے) کہہ دیجیے کہ تم جن کو اپنے خیالِ باطل میں خدائی میں دخیل سمجھتے ہو' اُن کو بلاؤ' (اور تحقیق کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ) وہ نہ تو آسمانوں میں ذرّہ بھر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں' اور نہ زمین و آسمان کے بنانے میں ان کا کچھ اختیار یا ساجھا ہے' اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا مددگار ہے۔''

(۱۰) ﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳﴾

(الفرقان)

''اور ان مشرکوں نے اللہ کے علاوہ ان کو بھی الٰہ بنا رکھا ہے جنہوں نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا بلکہ خود مخلوق (پیدا شدہ) ہیں' اور یہ (مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اس قدر عاجز ہیں کہ) نہ تو اپنے آپ کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر کو دفع کر سکتے ہیں اور نہ ان کو موت یا زندگی یا دوبارہ زندگی پر کوئی قدرت حاصل ہے۔''

(۱۱) ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ۝۶۲﴾ (الحج)

''یہ اس لیے ہے کہ صرف اللہ ہی الحق (سچا خدا) ہے اور یہ لوگ اُس کے علاوہ جسے بھی

پکارتے ہیں وہ باطل (جھوٹ) ہے اور بیشک اللہ ہی بلند مرتبہ اور بزرگی والا ہے۔''

(۱۲) ﴿یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهٗ وَمَا لَا یَنْفَعُهٗ ؕ﴾ (الحج:۱۲)

''وہ اللہ کو چھوڑ کر اُسے پکارتا ہے جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے۔''

(۱۳) ﴿وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝۶۶﴾ (یونس)

''اور یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں وہ کوئی اللہ کے (حقیقی) شرکاء کی پیروی تو نہیں کرتے۔ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں خیال کے اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔''

(۱۴) ﴿وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝۲۰ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ۚ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۙ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۝۲۱﴾ (النحل)

''اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں' انہوں نے کوئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ وہ تو خود پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ مُردہ ہیں' ان میں کوئی زندگی نہیں ہے' اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔''

(۱۵) ﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۴ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝۵﴾ (الاحقاف)

''(اے رسول ﷺ! آپ ان مشرکون سے) کہہ دیجیے کہ جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو' مجھے یہ تو بتا دو کہ انہوں نے دنیا میں کون سی چیز پیدا کی ہے؟ یا ان کا آسمانوں (کی تخلیق) میں کچھ ساجھا ہے؟ لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس سے پہلے کی یا کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو اگر تم سچے ہو! اور اُس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اللہ کو چھوڑ کر اُسے پکارتا ہے جو قیامت تک اُس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتا' اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں۔''

(۱۶) ﴿مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴﴾ (السَّجدة)

''اے لوگو! اللہ کے سوا تمہارے لیے نہ کوئی ولی (دوست) ہے نہ شفاعت کرنے والا۔

پس تم غور کیوں نہیں کرتے؟''

(۱۷) ﴿مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ﴾ (المؤمن:۳۳)

''(اے لوگو!) اللہ کے سوا تمہیں کوئی مصیبت سے بچانے والا نہیں ہے۔''

(۱۸) ﴿اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾﴾ (الاعراف)

''کیا یہ لوگ اُن کو اللہ کا شریک بناتے ہیں جنہوں نے کوئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ وہ خود پیدا کیے گئے ہیں؟ اور یہ (وہ عاجز لوگ ہیں جو) نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں۔''

(۱۹) ﴿مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ (الکہف:۳۹)

''(وہی ہوتا ہے) جو اللہ چاہتا ہے! اگر اللہ قوت نہ دے تو کسی شخص میں کوئی قوت یا طاقت نہیں ہے۔''

(۲۰) ﴿لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ﴾ (الحدید:۲۲)

''تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو جائے یعنی جاتی رہے تم اس پر افسوس مت کرو (کیونکہ وہ خدا کے حکم سے فوت ہوئی ہے) اور اگر اللہ تمہیں کچھ عطا کرے تو اس پر اتراؤ مت (کیونکہ وہ چیز تمہاری قابلیت یا کوشش سے نہیں ملی ہے)۔''

(۲۱) ﴿وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَاۗءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾﴾ (القصص)

''اور وہی اللہ ہے جس کے سوا دوسرا اِلٰہ (ساری کائنات میں) نہیں ہے۔ حمد و ثنا صرف اُسی کے لیے زیبا ہے' دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' اور حکمرانی اُسی سے مختص ہے اور تم سب اُسی طرف واپس بھیجے جاؤ گے۔ (اے رسول ﷺ! ان سے) کہو کیا تم نے غور کیا اگر اللہ رات کو قیامت تک طویل کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی عطا کر سکتا ہے؟ بھلا کیا تم سنتے نہیں ہو؟ (تم غور کیوں نہیں کرتے!)''

(۲۲) ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۨ ﴿۱﴾

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾﴾ (الفرقان)

''مبارک ہے وہ ذات جس نے نازل کیا فرقان (قرآن) اپنے بندے پر تاکہ وہ جہان والوں کے لیے نذیر ہو جائے۔ وہی ہے جس کے لیے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین کی' اور اُس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا اور حکومت میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے' اور اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر شے کی تقدیر معیّن کی۔ اور مشرکوں نے اس کے علاوہ ایسوں کو خدا بنا رکھا ہے جنہوں نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں (یعنی دوسروں کے محتاج ہیں) اور جن کا خود اپنے نقصان یا فائدے پر بھی کوئی بس نہیں چلتا' اور نہ مالک ہیں موت اور زندگی کے اور نہ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جانے کے۔''

ان آیات میں' جو میرے دعویٰ کے اثبات کے لیے کافی ہیں' اللہ ربّ العزت نے الوہیت کا ہشت گانہ معیار بیان فرمایا ہے' یعنی اللہ وہ ہے جو:

(۱) اپنے بندوں یا بندے پر فرقان نازل کر سکے۔

(۲) ساری کائنات پر حکومت کر سکے۔

(۳) اُس کا کوئی فرزند یا رشتہ دار نہ ہو (مثلاً بیوی بچے)

(۴) اُس کا کوئی شریک یا معین نہ ہو۔

(۵) وہ خالقِ کائنات ہو۔

(۶) اس نے ہر شے کی تقدیر معیّن کر دی ہو۔

(۷) وہ خود مخلوق یا مجبور یا محکوم نہ ہو۔

(۸) وہ' بلکہ صرف وہی' نفع اور نقصان' موت اور زندگی' صحت اور مرض' عزّت اور ذلّت' تونگری اور افلاس' راحت اور رنج کا مالک ہو۔

چونکہ کوئی انسان اس معیارِ ہشت گانہ پر پورا نہیں اُتر سکتا اس لیے منطقی طور پر بھی ثابت ہو گیا کہ کوئی انسان (خواہ وہ رسول کیوں نہ ہو) اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔

❁❁❁

اسلام دشمنی میں
صلیبیوں کے فکری و عسکری حملے

رضی الدین سیّد

ساتویں صدی عیسوی میں جب حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا ظہور ہوا تو عیسائیت نے اس نئے ابھرنے والے دین کو اپنا حریف تصوّر کرلیا اور کھل کر اس کے مدِمقابل آ گئی‘ حالانکہ اگر وہ اس دین پر غور وتدبر کرتی تو اسے اپنے عقیدے سے بہت قریب پاتی۔ محمدِ عربی ﷺ تو یوں بھی کسی خاص قوم یا خطے کے لیے مبعوث نہیں کیے گئے تھے بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے رحمۃٌ للعالمین تھے۔ نیز آپؐ پر نزول شدہ کتاب قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم سلامٌ علیہا کو بہت اچھے پیرائے میں یاد کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے نام پر پوری ایک سورۃ بھی نازل کی گئی۔ عیسائی جس طرح حضرت مریمؑ کو کنواری اور پاک مانتے ہیں‘ قرآن کریم نے اس سے بھی زیادہ انہیں پاکیزہ اور طاہرہ قرار دے کر یہودیوں کے غلیظ عقیدے پر بری طرح ضرب لگائی۔ اس لحاظ سے عیسائیوں کو نبی اکرم ﷺ سے ایک گونہ محبت ہونی چاہیے تھی‘ لیکن انہوں نے ایک بالکل ہی دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جنگ کا راستہ‘ مقابلے کا راستہ‘ اور مٹا دینے کا راستہ!

عیسائیت حیران تھی کہ جس مذہب نے رومن ایمپائر کی شکل میں ساری دنیا پر حکمرانی کی تھی‘ وہ اسلام کی زد میں کیسے آ گیا! دنیا اس وقت دو بڑے کیمپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ رومی سلطنت تھی یا پھر ایرانی بادشاہت! ہرقل روم نے ایرانی بادشاہت کو بھی ۶۲۸ء میں آخرکار زیر کرلیا تھا۔ عیسائیت کو اس بات کا بہرحال جواب نہیں مل پا رہا تھا کہ یہ مسلمان کیسے نئے فاتح تھے کہ بجائے زیر ہونے کے خود ابدی آقا (مسیحیت) کو بھی انہوں نے زیر کرنا شروع کر دیا تھا! یہودیوں کی

تعداد چونکہ سدا سے کم رہی ہے‘ عالمی خطے میں تب کوئی ایک ملک بھی انہیں حکمرانی کے لیے میسر نہ تھا‘ اس لیے عیسائیوں نے انہیں آسانی سے دبا لیا تھا۔ مسلمان چونکہ ایک سیلِ رواں بنتے جا رہے تھے‘ اس لیے تلوار کے ذریعے انہیں زیر کرنا عیسائیوں کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔

صلیبی جنگیں

صلیبیوں نے اپنے سامنے ہمیشہ ہی سے دو مقاصد رکھے ہیں: اوّلاً مسلمانوں سے مفتوحہ علاقے واپس لے لیں‘ اور ثانیاً پوری دنیا کو عیسائی بنا لیں۔ ان دونوں مقاصد کے لیے انہیں پروپیگنڈے‘ اشتعال انگیز تحریروں‘ تقریروں اور خوفناک جنگوں کی ضرورت تھی جس کا انہوں نے بھرپور استعمال کیا۔ اسلحے کے بل پر مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے انہوں نے کئی بار صلیبی جنگوں کا سلسلہ چھیڑا جن میں انہیں عمومی کامیابی مگر بالآخر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

انہوں نے تمام روم اور پھر فلسطین کو ارضِ مقدس قرار دیا اور ان کے حصول کی خاطر روا رکھی جانے والی جنگوں کو جنگِ مقدّس کا نام دیا۔ ان جنگوں میں عیسائیوں پر ہمیشہ مذہبی جنون طاری رہا۔ دور و نزدیک کے ہر ملک سے عیسائی‘ مسلمانوں کے خلاف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کے پادری اشتعال انگیز تقریریں کر کے اور حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کا حوالہ دے کر عوام کو اندھے مذہبی جنون میں مبتلا کرتے تھے۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ لوگ اپنے سینوں پر گرم لوہے سے صلیب کا نشان داغنے لگے اور جنگوں میں شرکت کے لیے جائیدادیں معمولی قیمت پر فروخت کرنے لگے۔ عورتیں‘ بچے اور بوڑھے لشکر کے آگے آگے رواں دواں رہتے تاکہ جنگی افراد کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے گھر بار‘ وطن‘ خاندان‘ کھیت‘ کھلیان اور زندگی کی ہر آسائش سے منہ موڑ لیا۔ ایک رومی پادری ’’اربن ثانی‘‘ نے ۱۰۹۵ء میں اپنے پورے زورِ خطابت کے ساتھ تقریریں شروع کیں جن میں عیسائیوں کو اسلامی خطروں کے خلاف متحد ہو جانے اور ظالم ’’سراسینوں‘‘ (صحرانشینوں: عربوں اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ایک غیر اخلاقی اصطلاح) سے یروشلم کی حفاظت کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس دور میں عیسائیوں کے مذہبی جذبات بھڑکانے کے لیے جس قسم کی تقریریں کی جاتی تھیں‘ ان کے بعض نمونے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) افسوس اے عالمِ مسیحیت' صد افسوس! دشمن یروشلم پر قابض ہو گیا ہے' مقدّس صلیب کھو گئی ہے' اور ہماری فوج برباد ہوئی ہے۔ افسوس کہ سمندر پار دجالی قوتیں برسرِ اقتدار آ گئی ہیں' مشرق میں شیطان کے جھنڈے بلند ہو گئے ہیں' اور مسلمانوں نے یروشلم کو پامال کر دیا ہے۔ (انجیل کی ایک عبارت۔ کتاب ''سلطان صلاح الدین ایوبی'' از ہیرالڈ لیئم' مترجم محمد یوسف عباسی' ص ۱۵۹۔ مشتاق بک کارنر' اردو بازار' لاہور)

(۲) عیسائیوں کی شکست محض ان کے گناہوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اگر خلوصِ دل سے دوبارہ جدّوجہد کی جائے تو خدا کے فضل سے عیسائی کامیاب ہوں گے اور اس مقدّس شہر پر صلیب کے پھریرے لہرائیں گے جو سنگ وخشت کا مجموعہ نہیں بلکہ نجاتِ آخرت کا ذریعہ اور فلاح کا زینہ ہے۔ (ایضاً' ص ۳۳۷)

(۳) ہم نے حلف اٹھایا ہے کہ جیتے جی یروشلم سے دستبردار نہ ہوں گے۔ ہم اپنے گھوڑوں اور مویشیوں کو ذبح کر دیں گے۔ ساز وسامان کو جمع کر کے آگ لگا دیں گے۔ گرجوں' قربان گاہوں' تبرکات اور پارچہ جات کو نذرِ آتش اور عورتوں اور بچوں کو تہِ تیغ کر دیں گے۔ پھر ہمارے پادری اور سپاہی موت کو للکارتے ہوئے تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ (ایضاً' ص ۱۵۱)

(۴) افسوس ہے عیسائیوں پر' گناہ گاروں اور سرکشوں پر' افسوس ہے ان پر جنہوں نے اس عظمتِ جہاں یروشلم کو کھو دیا۔ (ایضاً' ص ۱۵۹)

(۵) تمہیں کیا پروا کہ دشمنانِ خدا ہماری تذلیل کریں۔ تمہیں ان کے طعنوں سے کیا واسطہ! وہ ہمیں للکارتے ہیں: ''بلاؤ اب تمہارا خدا کہاں ہے؟ ہم نے تو تمہارے مقدّس مقامات پامال کر دیے ہیں۔ ہم نے تو تمہارے اسلاف کی توہم پرستی کے اکھاڑوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ ہمت ہے تو آؤ اب مقابلے میں! ہم نے فرانسیسیوں کے نیزے توڑ دیے ہیں' انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے ہیں' جرمن بہادروں کو نیچا دکھا دیا ہے' اور ہسپانوی سورماؤں کو مار بھگا دیا ہے۔ اب بلاؤ تم کسے بلاتے ہو؟ ہم نے تمہاری عورتوں کو ایسا داغ بیوگی دیا ہے کہ تمہارے گھروں سے اب سوگ کبھی ختم نہیں ہو گا۔ ہم نے تمہارے بچوں کو یتیم بنا کر خوشیاں ہمیشہ کے لیے چھین لی ہیں۔'' (ایضاً' ص ۳۵۸)

(۶) خدارا یروشلم کی مدد کرو! خداوند یسوع کے مقدّس شہر میں ابدی نجات کی راہیں کھلی ہیں۔

آؤ ابدی نجات کے طلبگارو آؤ! صلیب کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا دو۔ عیسائیت کے دشمنوں کو فنا کر دو۔ (ایضاً)

امریکی مصنف ''رون ڈیوڈ'' لکھتا ہے کہ ''ان تقریروں کے نتیجے میں مذہبی جذبات کے جوش میں اندھے ہو کر دانشور' رؤساء' سرکاری ذمہ دار' اور عام لوگ سب کے سب مل کر چلا اٹھے: شاید خدا کی مرضی یہی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے اسباب باندھنے شروع کر دیے۔ پوپ کی ہدایت پر ہزاروں افراد اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑے بڑے امیر خاندانوں کے بیٹے' جنہیں ورثے میں اپنے اپنے باپ کی زمینوں میں سے کچھ بھی نہ مل سکا تھا (صلیبی جنگوں کے نتیجے میں) وہ بھی اپنے لیے (فلسطین کی) نئی جائیدادیں حاصل کرنے کے لیے خصوصی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۱۰۹۴ء میں درباری امراء اور شہزادوں نے یروشلم کی طرف اپنا پہلا مارچ شروع کیا جس کی خاطر انہوں نے اپنے لمبے لباسوں پر سامنے کی طرف صلیبیں آویزاں کیں۔ آخر کار ۱۰۹۹ء میں یہ صلیبی یروشلم پہنچ ہی گئے۔ مقدّس شہر کی طرف پہنچ کر وہ خوشی سے اتنے دیوانے ہوئے کہ ان میں سے بیشتر لوگوں نے گھٹنوں کے بل پر جھک کر زمین کو بوسہ دیا اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چیخنے لگے: یروشلم' یروشلم!'' (ترجمہ کتاب ''قومیں جو دھوکا دیتی رہیں''۔ کراچی۔ ترجمہ راقم۔ ص ۳۸)

ایک اور مغربی مصنفہ لکھتی ہے: ''جون ۱۰۹۹ء کی صلیبی جنگ میں یورپ کے صلیبی مجاہد جب یروشلم کے گرد جمع ہوئے تو شہرِ مقدّس پر پہلی نظر پڑتے ہی ان پر ایک سکتے کی کیفیت پیدا ہو گئی جو بعد میں آہستہ آہستہ مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف غیظ وغضب میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد تین دن تک یہ صلیبی یروشلم میں منظم قتلِ عام کرتے رہے جس میں تیس ہزار کے قریب شہریوں کو انہوں نے تہِ تیغ کیا اور نظر آنے والے ہر ترک اور عرب مسلمان کا سر قلم کیا۔ مسجدِ اقصیٰ کی چھت پر دس ہزار مسلمان پناہ لیے ہوئے تھے' لیکن انہوں نے انہیں بھی چن چن کر قتل کیا۔ جو سپاہی یا افسر سب سے پہلے جس گھر میں داخل ہو جاتا' بلا شرکتِ غیرے وہ اس کا مالک ہو جاتا۔ تمام گلیاں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ (ایک شہر تین مذاہب۔ کیرن آرم سٹرانگ۔ ص ۴۳۰۔ تخلیقات' لاہور)

صلیبی لشکریوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ لوگ خدا کا منتخب گروہ ہیں اور خدا ہی

نے انہیں یہ صلیبی جنگ لڑنے کے لیے تیار کیا ہے۔ مسجد اقصیٰ کو انہوں نے اصطبل کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور اس میں اسلحہ اور سامانِ رسد بھی رکھنا شروع کر دیا تھا۔ (ایضاً‘ ص ۴۴۲)

اس جنگ میں بعض عیسائی اپنے ساتھ عورتوں کا جھنڈ بھی ساتھ لے کر آئے تھے تاکہ موقع ملتے ہی ان سے تسکین حاصل کر سکیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے دور کی جنگ میں عیسائیوں کی شکست کی ایک وجہ ان کی یہ بیماری بھی تھی۔

(بحوالہ کتاب ’’اُف یہ پادری‘‘ از متین خالد۔ ص ۱۱۸۔ علم و عرفان پبلشرز لاہور)

صلیب کی یہ جنگیں کئی عشروں تک لڑی گئیں حتیٰ کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ۱۱۸۷ء میں ان عیسائیوں کو جنگی طور پر ہمیشہ کے لیے مغلوب کر لیا۔ ان جنگوں میں عیسائیوں نے مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا تھا اور بے انتہا دہشت گردی دکھائی تھی۔ بقول رون ڈیوڈ:

’’عرب اس سارے معاملے سے ششدر رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر ان کا ایسا کون سا قصور ہے جس کے باعث سارے عیسائی ان پر حملہ آور ہو گئے ہیں!‘‘ (قومیں جو دھوکا دیتی رہیں۔ ترجمہ راقم‘ ص ۴۰)

علمی حملے

جنگوں کے ساتھ ساتھ عیسائیوں نے اسلام کے خلاف علمی لحاظ سے بھی حملے شروع کر دیے تھے اور جس طرح کے تمسخرانہ خاکے وہ آج تخلیق کر رہے ہیں‘ اسی طرح کی مضحکہ خیز چیزیں انہوں نے سترھویں صدی ہی سے شروع کر دی تھیں۔ مثلاً ایک مقام پر ان مستشرقین نے کہا کہ ’’محمد (ﷺ) نے ایک سفید کبوتر پالا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھ کر کان سے دانہ نکال کر کھاتا تھا‘ جس کا مقصد عام لوگوں کو یہ یقین دلانا ہوتا تھا کہ ایک فرشتہ کبوتر کی شکل میں ان کو وحی پہنچا رہا ہے۔‘‘ (کتاب ’’اسلام اینڈ دی ویسٹ‘‘ از فلپ کے حتی‘ ص ۵۴)

ایک اور مستشرق نکلسن نے قرآنِ پاک کے بارے میں لکھا کہ ’’قرآن‘ انجیلوں کے مستر داور غیر مصدقہ مواد پر مبنی کتاب ہے‘‘۔ (کتاب ’’انٹروڈکشن ٹو کوران‘‘ px, xix)۔

ایک دوسرے مستشرق ’’روڈ لِنسن‘‘ نے نبی مکرم ﷺ کے بارے میں لکھا کہ ’’اگرچہ وہ ایک غیر مخلص انسان نہیں تھے لیکن قرآن کو سمجھنے میں انہیں غلطی ہوئی تھی۔‘‘

قرآن پاک کا عیسائی مترجم J M Rodwell اپنے انگریزی ترجمے "The Koran"

مطبوعہ ۱۹۰۹ء کے دیباچے میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ’’جس انتہائی خفیہ انداز سے محمد (ﷺ) نے یہودی ربیوں اور عیسائی دوستوں سے ہدایات وصول کیں‘ اس کے باعث مکّہ کے جاہل اور بے دین سرداروں کے سامنے انہیں یہ اعلان کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں رہی کہ ان کی زبان سے بیان کردہ قدیم داستانیں ان پر خدا نے وحی کی ہیں۔ رفتہ رفتہ خود محمد (ﷺ) کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ اللہ ہی کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ وہ طویل عرصے تک (نعوذ باللہ) خود فریبی میں مبتلا رہے۔ انہیں (حاشا وکلا) مرگی کی بیماری تھی۔ اُداسی‘ خوشی اور بے ہوشی وغیرہ کے باعث ان کے لیے خود کے بارے میں ’’خدائی پیغمبر‘‘ ہونے کا دعویٰ کرنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ تاہم اصولوں اور کردار کی بعض اہم کمزوریوں کے باوجود انہوں نے عرب دنیا پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ ایک ایسا کارنامہ جو دنیا میں شاید ہی کسی نے انجام دیا ہو۔ قرآن پاک میں غلامی‘ قتل‘ ظلم اور کثرتِ ازواج پر اصرار کیا گیا ہے۔ انسانیت کو ایک جھوٹا مذہب عطا کرنے پر (معاذ اللہ!) محمد (ﷺ) کو ہم کتنا ہی بڑا مجرم قرار دیں لیکن ان کی ذاتی نیکیوں کا بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا۔‘‘

اسی طرح ایک اور نامور مستشرق ولیم میور نے اپنی کتاب ’’لائف آف محمدؐ‘‘ میں لکھا کہ (نعوذ باللہ!) ’’محمد (ﷺ) کو اپنی وحی پر خود بھی کامل یقین نہیں تھا۔‘‘ (مستشرقینِ مغرب کا اندازِ فکر۔ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی‘ کراچی‘ ص ۲۱۴‘ ۲۱۸)۔ دوسری طرف مارٹن لوتھر نے امریکہ میں گزشتہ صدیوں کی اسلام دشمن تحریریں جمع کر کے ان کی ایک کتاب شائع کی۔ اس نے لکھا کہ ’’شیطان‘ سراسین (صحرا نشین) اور ترک سب کے سب ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں‘‘۔ اس نے اسلام کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا اور کہا کہ عیسائیوں کے دشمن دو ہیں: اندرونی طور پر یورپ اور بیرونی طور پر اسلام۔‘‘ (ایضاً‘ ص ۱۴۹‘ ۲۰۲)

جب تک اسلام میدانِ جہاد میں عیسائیوں کے مدِمقابل رہا اور ان پر غالب آتا رہا‘ مستشرقین کی زبان گندی اور مضحکہ خیز رہی۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ‘ قرآن کریم اور اسلام کے لیے توہین آمیز زبان اور رکیک جملے استعمال کیے۔ ایک خیال یہ بھی پھیلایا گیا کہ مسلمان کچھ زیادہ ہی کافر (pagan) ہیں کیونکہ وہ محمد (ﷺ) کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں قائم شدہ فورٹ ولیم کالج اور ایشیاٹک سوسائٹی کے پس پردہ بھی یہی مقاصد پوشیدہ تھے۔

بعد کے ادوار میں جب سیاسی طور پر اسلام میں اضمحلال چھانے لگا اور مسلمان ان سے

مغلوب ہونے لگے‘ جو اٹھارہویں صدی کا دور تھا‘ تو مستشرقین نے نسبتاً سنجیدگی اختیار کرنا شروع کر دی۔ اب ان کے ہاں اسلام کے اثرات کو محسوس کیا جانے لگا اور کڑوی بات میٹھی زبان میں کہی جانے لگی۔ تاہم چونکہ اسلام مضمحل اور پسپا ہو رہا تھا اور اس کا اقتدار ڈوب رہا تھا‘ اس لیے ان کی زبان میں آقائیت در آئی تھی۔ اسی لیے انیسویں صدی کی ان کی تحریریں احساسِ برتری سے پُر ہیں۔ البتہ جیسے جیسے سیاسی خطرہ کم ہوتا گیا‘ ان کی اسلام دشمنی کی شدّت میں بھی کمی آنے لگی۔ پھر جب مغرب اہلِ اسلام پر حاوی ہو گیا تو انہیں اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے کی توفیق نصیب ہوئی اور اپنی تحریروں سے انہوں نے بے سرو پا قصے خارج کرنے شروع کر دیے۔ تھامس کارلائل بھی اسی دور کے سمجھ دار مصنفوں میں سے ایک ہے۔ وہ پہلا دانشور ہے جس نے نبی مکرم ﷺ اور قرآنِ پاک کی تعریف کی اور پہلے سے پھیلائی گئی غلط فہمیوں کی تردید کی ہے۔

عیسائیت چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے موسوم مذہب ہے‘ اس لیے عیسائیوں نے اسلام کو بھی ایک ایسا ہی مذہب سمجھا اور اسے ’’محمڈنزم‘‘ کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ تاہم اب اکیسویں صدی میں جا کر عیسائیوں کا یہ رجحان ختم ہوا ہے۔ آج جو ہمیں آکسفورڈ‘ برمنگھم اور دیگر غیر ملکی یونیورسٹیوں میں اسلامی شعبہ جات قائم ملتے ہیں‘ یہ دراصل عیسائیوں کی انہی مستشرقانہ کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

احادیث پر بھی ان دانشوروں کی زبانیں دراز رہی ہیں تاکہ اپنے لوگوں اور مسلم عوام کو ان کے بارے میں شکوک میں مبتلا کریں۔ مشہور مستشرقین ’’گولڈزیہر اور اسپرنگر‘‘ نے بتایا کہ عقائد اور رسوم و رواج میں تبدیلی کے لیے حسبِ ضرورت احادیث وضع کی گئیں اور ان کے الفاظ محمد (ﷺ) سے منسوب کیے گئے۔ انہوں نے لکھا کہ قرآنی بحثوں میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہوا تو احادیث گھڑ کر بحثیں طے کی گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث کے ذخیرے میں متضاد احادیث پائی جاتی ہیں۔

ایک اور مستشرق ونکسن ڈی ورڈ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ’’مسلمانوں کا مبلّغ جب اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو خطبہ ختم ہونے تک اس کے ایک ہاتھ میں تلوار رہتی ہے یا پھر یہ تلوار کسی ایسے بلند مقام پر رکھی ہوتی ہے کہ وہ سب کی نظروں میں رہے‘ تاکہ اسے دیکھ کر ہر شخص خوف زدہ رہے۔‘‘ (مستشرقین کا اندازِ فکر۔ ڈاکٹر عبد القادر جیلانی۔ ص ۱۸۹)

خلاصہ

مستشرقین کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ اور قرآن کریم کو اپنے مذہب سے ہمیشہ حقیر سمجھا‘ اسی طرح جیسے یہودی قوم عیسائیت‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائی عبادات کو آج بھی حقیر گردانتی ہے۔ ان مفکّرین نے دنیا پر تیزی سے چھا جانے والے اسلام کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی‘ بلکہ ہمیشہ طعن و تشنیع کے ذریعے حقیر ہی کرنا چاہا۔ کوشش کی کہ اسلام کی اشاعت کسی بھی طرح رک جائے۔ عیسائی دنیا کا آج بھی یہی حال ہے۔ وہ اسلام کو اب بھی ایک ایسا مذہب گردانتے ہیں جو دہشت گرد‘ اُجڈ اور جنگجو ہے۔ خوش قسمتی سے اکیسویں صدی میں اسلام ایک بار پھر ابھرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اس لیے عیسائی حکمرانوں اور اہلِ قلم نے اس کے خلاف اپنے ہتھیار ایک بار پھر تیز کر لیے ہیں۔ صلیبی جنگوں کا سلسلہ جو پہلے چلتا ہی رہتا تھا‘ غیر محسوس انداز میں ایک بار پھر جاری ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ سلمان رشدی‘ تسلیمہ نسرین اور اسریٰ نعمانی جیسی مبغوض شخصیتوں کو مکمل تحفظ دیتے اور اسلامی پردے اور خاندانی نظام کو بطورِ خاص نشانہ بناتے ہیں۔ مسلم خواتین کے چھوٹے سے نقاب کو تمام مغربی دنیا نے اپنے نشانۂ انتقام پر رکھا ہوا ہے جبکہ ہر داڑھی والے فرد کو وہ بیٹھے بٹھائے دہشت گرد پکار اٹھتے ہیں۔ چند سال پہلے جرمنی کی ایک عدالت میں ایک مکمل باحجاب مصری خاتون کو جج اور دیگر افراد کے سامنے چاقو مار مار کر ہلاک‘ جبکہ اس کے شوہر کو سخت زخمی کر دیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود اسلام کی اشاعت نہ پہلے بھی رک سکی تھی اور نہ اب کوئی روک سکتا ہے۔ قبولِ اسلام کی رفتار اب خود یورپ اور امریکہ میں اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ خود ان کے دانشور و مفکّرین عیسائی آبادی کے اقلیت میں تبدیل ہو جانے‘ اور اپنے اکثر شہروں کے مسلم شہروں میں ڈھل جانے کا خوف محسوس کر رہے ہیں۔

کاش‘ ان عیسائیوں نے اسلام کو دشمنی کی بجائے سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ تب انہیں اندازہ ہوتا کہ یہ دین تو تمام انسانوں کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ اگر اسلام کے سنہری اصول اور اخوت و محبّت کی ہدایات نہ ہوتیں تو اسپین اور اندلس میں عیسائی رعایا مسلم مجاہدوں کا از خود استقبال نہ کرتی۔ تب انہوں نے عیسائیت کے مقابلے میں اسلام ہی کو اپنے لیے باعثِ رحمت سمجھا تھا! ❁❁❁

خوفِ خدا اور فکرِ آخرت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ہر انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ایک مہلت ملی ہوئی ہے۔ یہ مہلت گزارنے کے بعد انسان کو موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری اور حقیقی زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اسلام کی یہ واضح تعلیم ہے کہ زندگی کی مہلت عمل کرنے کا وقفہ ہے۔ یہاں انسان کو آزادی ہے کہ جس طرح چاہے' اپنی زندگی گزارے۔ اُسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ زندگی اور موت پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ شرفِ انسانیت یعنی عقل سے کام لے کر اپنی زندگی اچھے کاموں میں گزارے اور بُرائیوں سے باز رہے۔ اچھائیوں اور بُرائیوں کی یہ پہچان اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس) ''پھر اس (نفس انسانی) کو بُرے کاموں اور اچھے کاموں کی سمجھ دے دی''۔ اب انسان کی مرضی ہے کہ وہ نفسانی خواہشات میں پڑ کر اپنی زندگی اللہ کی نافرمانی میں گزار دے یا خالق کو پسند آنے والے اعمال سرانجام دے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲﴾ (الملک) ''اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست بخشنے والا ہے۔'' گویا موت وحیات کا مقصد انسان کی آزمائش ہے۔ یہ دُنیا دارالعمل ہے اور موت کے بعد انسان دارالجزا میں ہوگا۔ وہاں اس کی نیکیاں اور برائیاں تولی جائیں گی اور اس کے لیے جنّت یا دوزخ کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔

چونکہ دُنیاوی زندگی کے اعمال پر انسان کی اُخروی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے اس لیے انسان کو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ اس زندگی کے ماہ و سال کو غنیمت سمجھے اور ہمہ وقت موت کو یاد رکھے۔ اچھے کام کرے اور بُرے کاموں سے باز رہے' کیونکہ موت وہ لمحہ ہوگا جس کے ساتھ

ہی عمل کرنے کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ انسان ہزار پچھتائے کہ میں اچھے کام کرتا مگر یہ ندامت بے سود ہوگی۔ اسلامی تعلیمات میں دی گئی یہ ہدایت عقلِ سلیم کے عین مطابق ہے کہ کبھی کبھی قبرستان میں جایا جائے تاکہ یہ خیال تازہ ہو جائے کہ یہ سب لوگ اپنی مہلتِ عمر گزار کر یہاں دفن ہو چکے ہیں۔ ان کی عملی زندگی ختم ہو چکی ہے' اب صرف اُن کے اعمال ہی ان کے کام آئیں گے اور عنقریب مَیں بھی یہاں ایک قبر میں دفن ہو جاؤں گا۔

ایک دن ایسا آئے گا کہ تمام کائنات ختم کر دی جائے گی۔ اُسے قیامت کا دن کہتے ہیں۔ وہ دن بڑا ہولناک ہوگا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قیامت کا ذکر ہے۔ آخری پاروں میں تو سراسر قیامت ہی کا تذکرہ ہے۔ سورۃ القارعہ میں فرمایا: ﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱﴾ ''اُس دن انسان ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے' اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگی روئی۔ تو جس کے (اعمال کے) وزن بھاری نکلیں گے' وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے' اُس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ اور تم کیا سمجھو کہ ہاویہ کیا چیز ہے۔ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔''

اُس روز تمام انسان دنیا میں کیے ہوئے اپنے کاموں کا حساب دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ جن لوگوں نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری میں زندگی گزاری ہو گی ان کو جنّت میں داخل کیا جائے گا۔ جنّت میں ایسی بے مثال نعمتیں ہوں گی کہ نہ کسی نے وہ آنکھوں سے دیکھی ہوں گی نہ کانوں سے سنی ہوں گی' اور نہ ہی کسی انسان کے ذہن میں ان جیسا تصوّر آیا ہوگا۔ جن لوگوں نے دنیا کی زندگی نفسانی خواہشات کے تابع گزاری ہو گی اور اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی والے اعمال کیے ہوں گے وہ جہنّم میں جائیں گے۔ جہنّم آگ کا الاؤ ہوگا جس کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا شدید ہوگی۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی جنّت یا دوزخ دنیا کی زندگی میں خود ہی تیار کر رہا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے!

جنّت کا ذکر قرآن مجید میں بار ہا آیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمۡ مِّنَ الۡجَنَّةِ غُرَفًا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۵۹﴾﴾ (العنکبوت)
''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو ہم بہشت کے اونچے اونچے محلوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ (نیک) عمل کرنے والوں کا یہ خوب بدلہ ہے۔ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسا کرتے ہیں۔''

سورۃ الزخرف میں ارشاد ہے: ﴿وَاَنۡتُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۱﴾ وَتِلۡکَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ لَکُمۡ فِیۡهَا فَاکِهَةٌ کَثِیۡرَةٌ مِّنۡهَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۷۳﴾﴾
''(اے اہلِ جنّت) تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ اور یہ جنّت جس کے تم مالک بنا دیے گئے ہو' تمہارے اعمال کا صلہ ہے۔ اس میں تمہارے لیے بہت سے پھل ہیں جن کو تم کھاؤ گے۔''

دوزخیوں کا ذکر بھی قرآن مجید میں کئی جگہ ہے۔ سورۃ الزخرف ہی میں ہے: ﴿اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۴﴾ لَا یُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِیۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡا هُمُ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوۡا یٰمٰلِکُ لِیَقۡضِ عَلَیۡنَا رَبُّکَ ؕ قَالَ اِنَّکُمۡ مّٰکِثُوۡنَ ﴿۷۷﴾﴾ ''اور گنہگار دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں نااُمید ہو کر پڑے رہیں گے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہی (اپنے آپ پر) ظلم کرتے تھے اور پکاریں گے اے مالک (داروغہ جہنّم) تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دے۔ وہ کہے گا کہ تم ہمیشہ (اسی حالت میں) رہو گے''۔ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡهِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَهَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ﴾ (آیت ۵۶) ''جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے کفر کیا ان کو ہم عنقریب آگ میں داخل کریں گے۔ جب بھی ان کی کھالیں گل جائیں گی تو ہم ان کی جگہ اور کھالیں بدل دیں گے تا کہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں۔''

چونکہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نیک و بداعمال کے نتائج کی خبر کرنا تھی اس لیے آپ کو جنّت اور دوزخ کا مشاہدہ سر کی آنکھوں سے کرا دیا گیا۔ حضور ﷺ نے جنّت و دوزخ کا وہ حال بیان کر دیا جس کا ان کو مشاہدہ کرا دیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مَیں تمہیں بتاتا ہوں

کہ اگر تم لوگ لذتوں کو توڑ دینے والی موت کو زیادہ یاد کرو تو وہ تمہیں اس غفلت میں مبتلا نہ ہونے دے گی۔ لہٰذا موت کو یاد کرو...... حقیقت یہ ہے کہ قبر ہر روز پکارتی ہے کہ مَیں مسافرت اور تنہائی کا گھر ہوں۔ مَیں مٹی اور کیڑوں کا گھر ہوں۔ آپ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ مرنے کے بعد جب بندے کا واسطہ اس زمین سے پڑتا ہے جس کے وہ سپرد ہوتا ہے تو اگر وہ حقیقی مؤمن ہو تو زمین کسی عزیز اور محترم مہمان کی طرح اس کا استقبال کرتی ہے اور کہتی ہے: مرحبا خوب آئے اور اپنے ہی گھر آئے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جتنے لوگ میرے اوپر چلتے تھے ان میں سب سے زیادہ محبوب اور چہیتے مجھے تم ہی تھے۔ آج جب تم میرے سپرد کر دیے گئے ہو اور میرے پاس آ گئے ہو تو تم دیکھو گے کہ میں تمہارے ساتھ کیا اچھا سلوک کرتی ہوں۔ پھر وہ زمین اس بندۂ مؤمن کے لیے حدِ نگاہ تک وسیع ہو جاتی ہے اور اس کے واسطے جنّت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ جب کوئی سخت بدکار قسم کا آدمی زمین کے سپرد کیا جاتا ہے تو زمین اس سے کہتی ہے کہ جتنے آدمی میرے اوپر چلتے پھرتے تھے تو مجھے ان سب سے زیادہ مبغوض تھا۔ آج تو میرے حوالہ کر دیا گیا ہے اور میرے قبضے میں آ گیا ہے تو تُو ابھی دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ پھر وہ زمین ہر طرف سے اُس کو بھینچتی اور دباتی ہے یہاں تک کہ اس دباؤ سے اس کی پسلیاں ادھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں۔ ابوسعید خدری ؓ کہتے ہیں' پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ڈال کر ہم کو اس کا نقشہ دکھایا۔ پھر فرمایا پھر اس پر ستر اژدھے مسلط کر دیے جاتے ہیں جن میں سے ایک اگر زمین پر پھنکار مارے تو رہتی دنیا تک وہ زمین کوئی سبزہ نہ اگا سکے۔ پھر یہ اژدھے اسے کاٹتے نوچتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت اور حشر کے بعد وہ حساب کے مقام تک پہنچا دیا جائے۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ قبر یا تو جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کی خندقوں میں سے ایک خندق ہے۔ (جامع ترمذی)

حضرت انس بن مالک ؓ کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا کہ میں نے اس جیسا خطبہ اب تک نہیں سنا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا: ''اگر تم اس چیز کو جان لو جس کو میں جانتا ہوں تو البتہ تم ہنسنا کم کر دو اور زیادہ رونے لگو۔'' (صحیح بخاری و صحیح مسلم) یہ سن کر اصحاب رسولؐ نے اپنے چہروں پر کپڑے ڈال لیے اور رونے لگے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا وَّلۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝﴾ (التوبة)
''یہ لوگ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں) ان کو ان کے اعمال کے بدلے جو وہ کرتے ہیں' بہت سا رونا ہوگا''۔ دنیا کی زندگی لہو ولعب، عیش پرستی اور آخرت کی زندگی کو بھلا کر ہنسی مذاق میں گزاری جائے تو انجام کار رونا ہی پڑے گا۔ اس کے مقابلے میں دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونا اچھا ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ عذاب کی سختیوں کو یاد کرتے اور کہتے: ''کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا!'' (بحوالہ معارف الحدیث II)

اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونا اللہ تعالیٰ کی رحمت لاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكٰى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِى الضَّرْعِ)) (سنن الترمذی) ''دوزخ کے اندر وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس پر حق تعالیٰ کے خوف سے گریہ طاری ہوگیا یہاں تک کہ دودھ تھن میں نہ لوٹ آئے۔''

اللہ تعالیٰ کو اس بندے کی حالت پر رحم آتا ہے جو اس کے خوف میں روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے خوف اور ہیبت سے جس بندۂ مومن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں اگرچہ وہ مقدار میں بہت کم مثلاً مکھی کے سر کے برابر (یعنی قطرہ ہی کے بقدر) ہوں' پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس چہرے کو دوزخ کے لیے حرام کردے گا۔ (سنن ابن ماجہ)

موت کے بعد کی زندگی کا تصوّر کر کے خدا کے خوف سے آنسو بہانا وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور انسان کے گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی ہیبت سے کسی بندہ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں تو اس وقت اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے کسی پرانے سوکھے درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔ (رواہ البزار)

دنیاوی زندگی میں آخرت کی زندگی کو یاد رکھنا، خوفِ خدا سے آنسو بہانا' اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا اور اللہ تعالیٰ کی رضا والے کام کرنا ہی اُخروی زندگی کی کامیابی ہے۔

❁❁❁

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۹)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

(۲) صوفیائے کرام کی تفاسیر

قرآن مجید کی تفسیر میں صوفیائے کرام سے کچھ ایسی باتیں منقول ہیں جو بظاہر لگتی تو تفسیر ہیں مگر وہ آیتِ قرآنی کے ظاہری اور ماثور معنی کے خلاف ہوتی ہیں‘ جیسے سورۃ التوبہ میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ (آیت ۱۲۳) ’’لڑائی کرو ان کافروں سے جو تم سے متصل (آس پاس) ہیں۔‘‘ اس کی تشریح کے تحت بعض صوفیاء نے کہا: قاتلوا النفس فانها تلی الانسان ’’نفس سے لڑائی کرو‘ کیونکہ وہ سب سے زیادہ انسان سے متصل ہے‘‘۔ اس قسم کے جملوں کو بعض لوگوں نے قرآن پاک کی تفسیر سمجھ لیا‘ حالانکہ درحقیقت وہ تفسیر کے ذیل میں نہیں آتے۔ صوفیاء کرام کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ قرآن کریم کی اصل مراد یہ ہے‘ اور جو مفہوم ظاہری الفاظ سے سمجھ آ رہا ہے وہ نہیں ہے‘ بلکہ وہ قرآن مجید کے ظاہری مفہوم پر جو اُس کے اصل ماخذ سے ثابت ہو‘ پوری طرح ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی اصل تفسیر وہی ہے‘ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ان وجدانی استنباط کو بھی ذکر کر دیتے ہیں جو اس متعلقہ آیت کی تلاوت کے وقت ان کے قلب پر وارد ہوئے۔

چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں صوفیاء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس آیت میں جہاد و قتال کا حکم مراد نہیں‘ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ کُفّار سے جہاد و قتال کا حکم تو اس آیت کا اصل تقاضا ہے ہی‘ لیکن اس آیت سے وجدانی طور پر انسان کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ سب سے قریبی نافرمان تو اس کا نفس ہے جو اسے بُرائیوں اور گناہوں پر آمادہ کرتا رہتا ہے‘ لہٰذا کُفّار سے جہاد و قتال کے ساتھ ساتھ اس

نفس سے بھی جہاد و قتال ضروری ہے۔ اس طرح یہ مفہوم تفسیرِ قرآنی کے خلاف نہیں رہتا۔

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲﴾ ’’پس ہرگز اللہ کے ساتھ شریک نہ بناؤ جبکہ تم جانتے بھی ہو‘‘۔ اس آیتِ قرآنی کی تفسیر میں سہل بن عبداللہ تُستریؒ لکھتے ہیں کہ ’اَنْدَاد‘ کے معنی ہیں ضد اور مخالف۔ نفسِ امارہ سب سے بڑا مخالف ہے جو ہدایتِ خداوندی کے برعکس لوگوں کو خواہشاتِ نفس کی پیروی کی تلقین کرتا ہے۔ اس قول سے مستفاد ہوتا ہے کہ لفظ ’اَنْدَاد‘ کا مفہوم وسیع ہے اور نفسِ امارہ بھی اس میں شامل ہے۔ گویا آیت کے معانی یہ ہیں کہ کسی بُت‘ شیطان یا نفسِ امارہ کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اب ظاہری معنیٰ سے یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی‘ اس لیے کہ آیت کے سیاق و سباق اور قرائن و آثار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اَنْدَاد سے وہ معبود مراد ہیں جن کی پوجا کی جاتی تھی‘ خواہ وہ بُت ہوں یا کچھ اور۔ اب ظاہر ہے کہ نفس امارہ کی پوجا اور پرستش نہیں کی جاتی تھی‘ تاہم اس امر کا احتمال ہے کہ یہ مفہوم بھی صحیح ہو اور اس کی وجہ حسبِ ذیل ہے۔ صوفیاء عبرت پذیری کے نقطۂ نظر سے کسی آیت قرآنی کے بعض ایسے معانی مراد لیتے ہیں جن کے بارے میں وہ آیت نازل نہیں ہوئی‘ اس لیے کہ وہ معنی اس آیت کے مقصدِ نزول سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ سہل تستری نے جب یہ مفہوم بیان کیا تو ان کا مطلب شاید یہ نہ تھا کہ وہ اس آیت کی بس یہی تفسیر کر رہے ہیں‘ بلکہ ان کا منشا یہ تھا کہ نفس امارہ بھی شرعی اعتبار سے نِدّ (اللہ کا شریک) ہی ہے‘ اس لیے کہ نِدّ شریک اور مخالف کو کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ نفس امارہ اس اعتبار سے ربّ کائنات کا شریک ہے کہ وہ نفسِ انسانی کو غلط اور گناہ کی راہ پر ڈالتا ہے جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہے۔ لوگوں نے جو بُت بنا رکھے تھے وہ بھی منشائے ربّانی کی مخالفت کے لیے ہی تھے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ شبلی سے وضو اور نماز کے معنی دریافت کیے گئے‘ انہوں نے جواب دیا کہ اوّل الذّکر فصل اور دوسرا وصل ہے۔ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وہ دنیا سے علیحدگی اختیار کرتا ہے‘ یہ فصل ہے اور جب وہ نماز پڑھتا ہے تو وہ اللہ کے حضور میں ہوتا ہے‘ اور یہ وصل ہے۔

صوفیائے کرام کے اس قسم کے اقوال اور اشارات کے بارے میں بہرحال درج ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱) ان اقوال کو قرآن مجید کی تفسیر قرار نہ دیا جائے‘ بلکہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ قرآن کریم کی

اصل مراد وہی ہے جو کہ تفسیر کے اصل مآخذ سے سمجھ آتی ہے اور یہ اقوال یا اشارات محض وجدانی استنباط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان اقوال کو قرآن کریم کی اصل تفسیر سمجھ لیا جائے تو پھر یہ گمراہی ہے۔ ابوعبدالرحمان سلمی نے ایک کتاب ’حقائق التفسیر‘ کے نام سے لکھی تھی جو کہ اسی قسم کے اقوال پر مشتمل تھی۔ اس کے بارے میں امام واحدی نے کہا کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہو جائے گا۔ (الاتقان)

(ب) اس قسم کے اقوال میں سے بھی صرف ان اقوال کو درست سمجھا جا سکتا ہے جن سے قرآن کریم کی کسی آیت کے ظاہری مفہوم یا شریعت کے کسی مسلّمہ اصول کی نفی نہ ہوتی ہو۔ اگر ان وجدانیات یا اقوال کے پردے میں دین اسلام کے مسلّمہ اصول وقواعد کی خلاف ورزی ہو رہی ہو تو انہیں کسی صورت بھی قبول نہیں کیا جائے گا‘ خواہ وہ کسی بھی شخصیت سے منسوب ہوں۔ یہ کھلم کھلا الحاد ہے۔

(ج) اس قسم کے وجدانی اقوال اور اشارات صرف اس وقت معتبر ہو سکتے ہیں جب وہ قرآن مجید کی تحریف کی حد تک نہ پہنچتے ہوں۔ اگر قرآن پاک کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کوئی بات کہی جائے تو وہ بھی صریح الحاد اور گمراہی ہے‘ جیسے ایک شخص نے سورۃ البقرۃ کی آیت قرآنی ﴿مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ﴾ ’’کون ہے جو شفاعت (سفارش) کر سکے!‘‘ کے حوالے سے کہا کہ اصل میں مَنْ ذَلَّ ذِیْ یَشْفَ عُ ہے۔ ذِیْ سے مراد نفس ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص نفس کو ذلیل کرے گا‘ شفا پا جائے گا۔ علامہ سراج الدین بلقینی سے اس بارے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ایسا کہنے والا ملحد ہے۔ (الاتقان)

(د) ماضی میں ملحدوں کا ایک فرقہ ’باطنیہ‘ کے نام سے گزرا ہے‘ جس کا دعویٰ یہ تھا کہ قرآن مجید سے ظاہری طور پر جو مفہوم و مطلب سمجھ میں آتا ہے‘ حقیقت میں وہ اللہ کی مراد نہیں ہے بلکہ ہر لفظ سے ایک باطنی معنیٰ اور مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور وہی قرآن پاک کی اصل تفسیر ہے۔ اس اعتقاد کے کفر والحاد ہونے پر اجماعِ اُمّت ہے۔ اب صوفیاء کے کسی قول کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد رکھنا باطنیت اور کفر ہوگا۔ (بطور نمونہ باطنیہ کی تفسیر قرآن کے حوالے سے چند تاویلات ملاحظہ کریں۔ مثلاً ’وضو‘ سے مراد امام کی پیروی ہے۔ جو شخص غیر شعوری طور پر کسی راز کو افشا کر دے‘ اس سے دوبارہ رازداری کا عہد لینے

کو ’غسل‘ کہتے ہیں۔ ’کعبہ‘ سے حضورِ اقدس ﷺ مراد ہیں۔ ’باب‘ (دروازہ) سے مراد حضرت علی ؓ ہیں۔ تکلیف سے آرام پانے کا نام ’جنت‘ ہے۔ مشقت اٹھانے کو ’جہنم‘ کہا جاتا ہے۔ ’زکوٰۃ‘ کا مطلب یہ ہے کہ باطنی عقائد و احکام کا علم حاصل کر کے اپنے نفس کو پاک کیا جائے۔ وغیرہ۔

مندرجہ بالا چار امور کی رعایت کے ساتھ صوفیائے کرام کے اقوال و اشارات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے‘ اور بلاشبہ بعض مخصوص واردات اور احوال رکھنے والے اشخاص کو ان باتوں سے فائدہ بھی پہنچا ہے۔ اسی وجہ سے علامہ آلوسی اپنی تفسیر ’روح المعانی‘ میں آیات قرآنی کی مکمل تفسیر لکھنے کے بعد ایک مستقل عنوان ’من باب الاشارۃ فی الآیات‘ قائم کرتے اور اس میں اس قسم کے وجدانیات کا ذکر فرماتے ہیں۔ مذکورہ بالا ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام نے تفسیر قرآن کریم کے تحت اپنے جو وجدانیات ذکر کیے ہیں‘ وہ قرآن و سُنّت کے خلاف نہیں ہیں اور بعض لوگوں نے ان پر باطنیت کا جو الزام عائد کیا ہے‘ وہ بالکل درست نہیں۔ اس سب کے باوجود الاتقان کے حوالے سے حافظ ابن الصلاح کے اس ارشاد کو نقل کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا:

ومع ذلک فیالیتھم لم یتساھلوا بمثل ذلک لما فیہ من الایھام والالباس (اس کے باوجود اے کاش! یہ حضرات اس قسم کے اقوال نقل کرنے میں اتنے تساہل سے کام نہ لیتے‘ کیونکہ ان میں غلط فہمی اور اشتباہ کی بڑی گنجائش ہے)۔ اس ضمن میں علامہ شاطبی کا کہنا ہے کہ صوفیاء سے یہ اقوال عبرت انگیزی کے نقطۂ خیال سے صادر ہوئے ہیں‘ تاہم ان کو قرآن پاک کے معانی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ درست ہے کہ جن صوفیاء سے یہ اقوال صادر ہوئے ہیں‘ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم قرآن کی شرح و تفسیر کر رہے ہیں۔ یہ بات صوفیاء کے ساتھ حسن ظن کی آئینہ داری کرتی ہے (الموافقات)۔ اسی طرح تفتازانی نے شرح عقائد نسفی میں تحریر کیا ہے کہ بعض محققین نے جو یہ بات کہی ہے کہ اگرچہ نصوص کو ان کے ظواہر پر محمول کیا جاتا ہے‘ تاہم ان میں ایسے پوشیدہ اشارات بھی پائے جاتے ہیں جو اربابِ سلوک پر ہی منکشف ہوتے ہیں‘ تو یہ بات ان کے کمالِ ایمان اور تمام عرفان کی غمازی کرتی ہے۔

آخر میں ثابت ہوا کہ متذکرہ بالا شروط جب صوفیاء کے اقوال و اشارات (تفسیر اشاری) میں موجود ہوں گی تو وہ مقبول ہوں گے۔ مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ردّ نہیں کیا جائے

گا۔ یہ معنی نہیں کہ اس کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ردّ نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہر کے منافی نہیں اور کوئی شرعی دلیل اس کے معارض نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ اس کا تسلیم کرنا ضروری نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اقوال واشارات وجدانیات کے قبیل سے ہیں‘ اور وجدانیات کی اساس کسی دلیل وبرہان پر نہیں رکھی جاتی۔ یہ ایک ایسی بات ہوتی ہے جو صوفی کے دل میں آتی ہے اور یہ صوفی اور اُس کے ربّ کے درمیان ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے‘ اس لیے صوفی خود تو اس پر عمل کر سکتا ہے مگر کسی دوسرے کو اس کا پابند نہیں بنا سکتا اور نہ ہی بنانا چاہیے‘ یہ دوسرے کی مرضی پر منحصر ہے۔

معروف مفسر علامہ محمود آلوسی جن کی تفسیر میں صوفیائے کرام کے وجدانی استنباطات بکثرت ملتے ہیں‘ صوفیاء کے منشاء کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ’’قرآن کریم میں سادات صوفیاء سے جو کلام منقول ہے‘ وہ درحقیقت ان دقیق امور کی طرف اشارے ہوتے ہیں جو اربابِ سلوک پر منکشف ہوتے ہیں‘ اور ان اشارات میں اور قرآن کریم کے ظاہری مفہوم میں جو حقیقۃً مراد ہوتا ہے‘ تطبیق ممکن ہے۔ صوفیاء کا یہ اعتقاد نہیں ہوتا کہ ظاہری مفہوم مراد نہیں اور باطنی مفہوم مراد ہے‘ اس لیے کہ یہ تو باطنی ملحدوں کا اعتقاد ہے جسے انہوں نے شریعت کی بالکلیہ نفی کا زینہ بنایا ہے۔ ہمارے صوفیائے کرام کا اس اعتقاد سے کوئی واسطہ نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ جبکہ صوفیاء نے یہ تاکید کی ہے کہ قرآن مجید کی ظاہری تفسیر کو سب سے پہلے حاصل کیا جائے۔ (مقدمہ روح المعانی)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ فہم قرآن کا میدان بہت وسیع ہے‘ جو شخص اوّلین وآخرین کے علوم سے آگاہ ہونا چاہتا ہے وہ قرآن کا (بغور) مطالعہ کرے۔ خود قرآن حکیم کی سورۃ الانعام میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (آیت ۳۸) ’’اور ہم نے کتاب (قرآن) میں کسی چیز کی کمی باقی نہیں چھوڑی۔‘‘

(۳) حذفِ اسناد

تفسیر ماثور کے اسبابِ ضعف میں اسناد کا حذف کرنا بھی شامل ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل اُمور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو روایت بھی کسی سے اخذ کرتے‘ اس میں صحت کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ جب تک ان کو صحت روایت کا یقین نہیں ہو جاتا تھا وہ اس روایت کو آگے بیان نہیں کرتے تھے۔ مگر وہ سند کے

بارے میں پوچھنے کے عادی نہ تھے۔ اس کی وجہ حضرات صحابہؓ کے دور کی امانت وعدالت تھی۔ بعض صحابہؓ کے بارے میں جو یہ معروف ہے کہ وہ شہادت یا حلف لیے بغیر کوئی روایت قبول نہیں کرتے تھے تو اس کی وجہ مزید پختگی اور اطمینان قلب ہے‘ عدم اعتماد ہرگز نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت اُبی بن کعبؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے ایک حدیث روایت کی تو حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ اس کی تائید میں شہادت پیش کریں۔ چنانچہ کچھ انصاری صحابہؓ نے گواہی دی کہ ہم نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے فرمایا کہ مَیں نے آپ کو متہم نہیں کیا‘ مَیں صرف تائید چاہتا تھا۔ (اسلوب الحدیث)

صحابہؓ کے بعد جب تابعین کا دور آیا اور وضع حدیث کا چرچا ہونے لگا تو پھر سند کے بغیر کسی روایت کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ جب سند میں کوئی غیر ثقہ راوی ہوتا تو ایسی روایت ردّ کر دی جاتی۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں مشہور تابعی ابن سیرینؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ پہلے اسناد کے بارے میں دریافت نہیں کیا جاتا تھا‘ جب (وضع حدیث کے) فتنہ کا آغاز ہوا تو اسناد ورجال کے بارے میں پوچھا جانے لگا۔ عصر تابعین میں معاملہ یونہی چلتا رہا۔ جو تفسیر بھی حضور ﷺ یا صحابہؓ سے نقل کی جاتی‘ اس کے ساتھ سند مذکور ہوتی تھی۔ عہد تابعین کے بعد ایسے اشخاص منظر عام پر آئے جنہوں نے تفسیر قرآن سے متعلق تمام ذخیرہ یکجا کر دیا۔ اس میں احادیث نبویہؐ کے ساتھ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اقوال وآثار مع سلسلہ اسناد محفوظ تھے‘ جیسے سفیان بن عیینہ‘ وکیع بن الجراح اور دیگر علماء کی تفاسیر وغیرہ۔ پھر ایسے لوگ سامنے آئے جنہوں نے کتب تفاسیر تالیف کیں اور اسانید کو حذف کر کے تفسیری اقوال کو ان کے قائلین کی جانب منسوب نہ کیا۔ چونکہ انہوں نے صحت سند کا التزام نہ کیا‘ اس لیے صحیح وسقیم اقوال باہم مل جل گئے اور اصل کی پہچان مشکل ہوگئی۔ اس کے بعد تو یہ حالت ہوگئی کہ جس شخص کو بھی کوئی قول ملتا‘ وہ اسے نقل و روایت میں کوئی باک نہ سمجھتا اور نہ اسے کچھ محسوس ہوتا۔ پھر بعد میں آنے والوں (متأخرین) نے بے خوف وخطر یہ سمجھتے ہوئے ایسے اقوال کو نقل کر دیا کہ یہ اصل صحیح پر مبنی ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ متقدمین (سلف) کی کسی تحریر یا تائید کے متلاشی نہیں ہوتے تھے۔ (الاتقان)

اس باب میں حق بات یہ ہے کہ اسناد کا حذف کرنا تمام اَسبابِ ضعف سے زیادہ خطرناک اور ہلاکت خیز تھا۔ حذفِ اَسناد کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ جو کوئی بھی ایسی کُتب تفاسیر کو دیکھتا وہ ان کے

مندرجات اور حوالہ جات کو صحیح اور مستند خیال کرتا۔ اسی طرح اکثر مفسّرین ان سے متعلقہ اسرائیلی روایات‘ غیر مستند اور وضعی واقعات کو صحیح اور ثقہ سمجھ کر نقل کرنے لگے‘ حالانکہ یہ عقل و نقل دونوں کے بالکل خلاف تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وضع حدیث اور اسرائیلی روایات (اسرائیلیات) دونوں خطرناک ہیں‘ مگر حذفِ اَسناد کی ہلاکت ان دونوں سے بڑھ کر ہے۔ اَسناد کا ذکر کرنے کی صورت میں اس خطرے کی تلافی ممکن تھی‘ مگر صد حیف کہ حذفِ اَسناد یا راوی کا نام لیے بغیر روایت کرنا کہ کسی نے کہا‘ اس عمل نے ہر چیز اور بات کو بعد والوں کے لیے بالکل تاریک کر دیا۔ اے کاش! جن اشخاص نے اسانید کو حذف کر کے مختلف اقوال و آثار کو جمع کیا تھا‘ وہ کم از کم اپنی تفسیر میں ابن جریر طبری کی طرح ہر قول کو مع سند ہی ذکر کرتے۔ ابن جریر نے اپنی مرویات میں اگرچہ صحت کا التزام نہیں رکھا مگر ان کا عذر یہ ہے کہ انہوں نے ہر روایت کی سند بیان کر دی ہے اور پڑھنے والا اس میں صحیح اور غلط کی پہچان کر سکتا ہے۔ علمائے سلف کے ہاں جب کسی روایت کو اس کی صحیح سند کے ساتھ ذکر کر دیا جائے تو پھر تحریر کرنے والے کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ عہدِ سلف میں عمومی طور پر راویوں کے حالات وغیرہ معروف تھے اور متعلقہ روایت کے صحیح‘ غلط یا وضعی ہونے کا اسی سے پتہ چل جاتا تھا۔ لیکن بعد کے زمانے میں کیفیات بدل گئیں اور حذفِ اَسناد سے زبردست فتنہ و گمراہی پھیلنے لگی۔

❁❁❁

(جاری ہے)

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Feb 2022
Vol.71
Regd. CPL No.115
No.2
Monthly **Meesaq** Lahore